قرآن اور حدیث

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

فہرست

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

اتباع و اطاعت رسول

(یہ مضمون مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کی کتاب
"تعلیماتِ قرآن" پر تنقید کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے۔)

صاحب "تعلیمات قرآن" نے رسالت اور اس کے احکام کی تشریح کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ میرے نزدیک رسالت کے اس تصوّر سے موافقت نہیں رکھتے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ کتاب کے صفحہ ۵۹ پر فاضل مؤلّف نے لکھا ہے:۔

"اصولی قانون صرف اللہ کی کتاب ہے:۔

اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَلَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ (اعراف۔۱)

جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے اوپر اتارا گیا ہے اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

جملہ ضوابط اسی کی روشنی میں باہمی مشورے سے بنائے جائیں گے:۔

وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ

اور ان کی حکومت آپس کے مشورہ سے ہے۔

یہاں مولّف نے زنجیر میں سے اسوۂ رسول کو صاف اڑا دیا ہے، ان کی تجویز یہ ہے کہ قرآن کریم سے اصول لے کر مسلمان باہمی مشورے سے تفصیلی قوانین وضع کرلیا کریں۔ لیکن ان دونوں کڑیوں کے درمیانی سلسلہ کی ایک اور کڑی بھی تھی جس کو خود اللہ تعالیٰ نے اس زنجیر میں پیوست کیا تھا۔ وہ کڑی یہ ہے:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آل عمران ۔ ۴)

اے محمد! کہو اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم سے محبت کرے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اصولی قانون قرآن ہی ہے مگر یہ قانون ہمارے پاس بلا واسطہ نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ رسول خدا کے واسطے سے بھیجا گیا ہے اور رسول کو درمیانی واسطہ اسلیے بنایا گیا ہے، کہ وہ اصولی قانون کو اپنی اور اپنی امّت کی عملی زندگی میں نافذ کر کے ایک نمونہ پیش کر دیں اور اپنی خداداد بصیرت سے ہمارے لئے وہ طریقے متعین کر دیں جن کے مطابق ہمیں اس اصولی قانون کو اپنی اجتماعی اور انفرادی برتاؤ میں نافذ کرنا چاہیئے۔ پس قرآن کی رو سے صحیح ضابطہ یہ ہے کہ پہلے خدا کا بھیجا ہوا قانون پھر خدا کے رسول کا بتایا ہوا طریقہ، پھر ان دونوں کی روشنی میں ہمارے اولی الامر کا اجتہاد:۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء ۔ ۸)

اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان اولی الامر کی جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو تو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔

"فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ" کا فقرہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ مسائل شرعی میں جب مسلمانوں کے درمیان نزاع اور اختلاف واقع ہو تو حکم ہے کہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ اگر مرجع صرف قرآن مجید ہوتا تو صرف فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰہِ کہنا کافی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وَالرَّسُوْلِ بھی کہا گیا ہے جس میں صاف اشارہ ہے کہ قرآن کے بعد رسول کا طریقہ تمھارے لیے مرجع ہے۔

اس کے بعد مؤلف نے صفحہ ۱۲۸ پر لکھا ہے :۔

"رسولوں کا فریضہ صرف پیغام الٰہی پہونچانا ہے اور بس :۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ (المائدہ - ۱۳)
رسول کے اوپر کچھ نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ (پیغام) پہنچا دے۔

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ۔ (یٰسٓ - ۲)
اور ہمارے اوپر سوائے واضح تبلیغ کے اور کچھ نہیں ہے۔

آگے چل کر صفحہ ۱۵۵ پر لکھتے ہیں :۔

"اور بحیثیت منصب رسالت رسول کا فریضہ صرف پیغام الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس :۔

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلَاغُ (الشوریٰ ۵)
تیرے اوپر صرف تبلیغ ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ (تغابن ۲)
اگر تم نے منہ پھیر لیا تو ہمارے رسول پر صرف کھلی ہوئی تبلیغ ہے اور بس۔

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ
تجھ پر پہنچانا ہے اور ہمارے اوپر

وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد۔۱)   حساب لینا ہے ـــ"

یہاں مؤلف نے آیات کے سیاق وسباق اور فحوائے کلام کو نظرانداز کر کے رسول کی حیثیت کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ گویا وہ محض ایک نامہ بر یا نعوذ باللہ ڈاک کا ہرکارہ ہے۔ لیکن اگر وہ ان جملوں کو ان عبارات کے سیاق وسباق سے ملاکر پڑھتے جن میں یہ وارد ہوئے ہیں تو انھیں خود معلوم ہو جاتا کہ دراصل یہ جو کچھ کہا گیا ہے یہ نبی پر ایمان لانے والوں سے نہیں بلکہ اس کا انکار کرنے والوں سے تعلق رکھتا ہے۔ جو لوگ رسول کی تعلیم قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور بار بار رسول کو جھٹلاتے تھے ان سے کہا گیا ہے کہ رسول کا کام تم تک ہمارا پیغام پہونچا دینا تھا، سو اس نے پہونچا دیا۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے پاس کوئی رہنما نہیں بھیجا گیا۔ مَاجَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ (المائدہ ۳) اب خدا پر تمہاری کوئی حجت نہیں رہی۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ (النساء ۲۳) اب تم نہ مانو گے تو اپنا ہی کچھ بگاڑو گے۔ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (المائدہ۔۳) اسی سلسلہ میں رسول اللہ سے بھی فرمایا گیا ہے کہ تم ان کافروں کی روگردانی سے دل گرفتہ کیوں ہوتے ہو؟ تم ان پر داروغہ نہیں بنائے گئے ہو۔ تمہارے سپرد جو خدمت کی گئی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ان کے سامنے سیدھا راستہ پیش کر دو۔ سو وہ تم نے پیش کر دیا۔ اب رہی یہ بات کہ اس راستے پر یہ آتے ہیں یا نہیں، تو اس بارے میں کوئی ذمہ داری تم پر نہیں۔ تمہارا یہ کام نہیں کہ ان کو کھینچ

کر اس راستہ کی طرف لاؤ۔ اگر وہ تمہاری تعلیم و تبلیغ سے منہ موڑ کر ٹیڑھے راستوں پر چلتے ہیں تو ان کے اس فعل کی کوئی بازپرس تم سے نہ ہوگی۔ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ (الشوریٰ) فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیہ)

یہ سب کچھ کفار کے مقابلہ میں ہے۔ رہے وہ لوگ جو اسلام قبول کر لیں اور امّتِ مسلمہ میں داخل ہو جائیں تو ان کے لئے رسول کی حیثیت محض پیغام پہونچا دینے والے کی نہیں ہے بلکہ رسول ان کے لیے معلّم اور مربی بھی ہے۔ اسلامی زندگی کا نمونہ بھی ہے اور ایسا امیر بھی ہے جس کی اطاعت ہر زمانے میں بے چون وچرا کی جانی چاہئے۔ معلم کی حیثیت سے رسول کا کام یہ ہے کہ پیغام الٰہی کی تعلیمات اور اس کے قوانین کی تشریح و توضیح کرے۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ مربی ہونے کی حیثیت سے اس کا کام یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات اور قوانین کے مطابق مسلمانوں کی تربیت کرے۔ اور ان کی زندگیاں اسی سانچے میں ڈھالے" وَيُزَكِّيهِمْ"۔ نمونہ ہونے کی حیثیت سے اس کا کام یہ ہے کہ خود قرآنی تعلیم کا عملی مجسمہ بن کر دکھائے تاکہ اس کی زندگی اس زندگی کی ٹھیک ٹھیک تصویر ہو جو کتاب اللہ کے مقصود کے مطابق ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہئے۔ اور اس کے ہر قول اور فعل کو دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ زبان کو اس طرح استعمال کرنا اور اپنی قوتوں سے یوں کام لینا اور دنیا کی زندگی میں ایسا برتاؤ رکھنا کتاب اللہ کے مقصود کے مطابق ہے۔ اور جو کچھ اس کے خلاف ہے وہ منشاءِ کتاب کے خلاف ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ

حَسَنَۃٌ اور وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ اس کے ساتھ ہی رسول کی حیثیت مسلمانوں کے امیر کی بھی ہے۔ ایسا امیر نہیں جس سے نزاع کی جائے، بلکہ ایسا امیر جس کے حکم کو بے چون وچرا ماننا ویسا ہی فرض ہے جیسا قرآن کی آیات کو ماننا فرض ہے۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اور وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ ایسا امیر نہیں جو اپنی زندگی ہی میں امیر ہوتا ہے بلکہ ایسا امیر جو قیامت تک کے لیے امت مسلمہ کا امیر ہے۔ جس کے احکام مسلمانوں کے لیے ہر زمانہ اور ہر حال میں مرجع ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کی جتنی آیات اوپر پیش کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی زمانہ کے ساتھ مقیّد نہیں ہے، نہ منسوخ ہے۔

مؤلف نے منصب رسالت کے ان مراتب کے سمجھنے میں تین بہت بڑی غلطیاں کی ہیں۔

۱:۔ پہلی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے بعض آیات کا غلط مفہوم لے کر رسول کا کام صرف تبلیغ (یعنی نامہ بری) میں محدود کر دیا، حالانکہ رسول کی مبلغانہ حیثیت صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ لوگ دائرہ اسلام کے باہر ہوں اور صرف ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے رسول کی تعلیم کو ابھی قبول نہ کیا ہو۔ رہے وہ لوگ جو اسلام قبول کر کے امّتِ مسلمہ میں داخل ہو جائیں تو ان کے لیے رسول کی حیثیت محض مبلّغ کی نہیں ہے بلکہ وہ ان کا لیڈر ہے۔ فرماں روا ہے، مقنّن ہے، معلّم ہے، مربّی اور واجب التقلید نمونہ ہے۔

۲:۔ مؤلف کی دوسری غلطی اس پہلی غلطی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے جب

انھوں نے رسول کو مسلمانوں اور غیر مسلموں، سب کے لیے محض مبلغ قرار دے لیا تو ان کو یہ زحمت پیش آئی کہ قرآن میں جو رسول کو مسلمانوں کے لیے مربّی معلم اور نمونہ قرار دیا گیا ہے اس کا کیا مفہوم متعین کیا جائے۔ آخر کار انھوں نے رسول کی ان سب حیثیات کو تبلیغ نبی کے ضمن میں شامل کر دیا۔ اور اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ مبلغانہ حیثیت کے ماسوا آنحضرتؐ کی زندگی کے اور جتنے پہلو ہیں وہ سب آپ کی شخصی (پرائیویٹ) حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"آیت وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى کا یہ مفہوم قرار دینا کہ رسول اللہ جو کچھ کلام کرتے تھے وہ سب کا سب وحی تھا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ دعویٰ قرآن کے وحی ہونے کا تھا جس کا کفار انکار کرتے تھے۔ اس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ جو کچھ بولتے ہیں وحی ہے۔ گھر یا ازواج مطہرات یا باہر دیگر حضرات سے جو گفتگو فرماتے تھے اس کے متعلق نہ وحی ہونے کا دعویٰ تھا نہ کفّار کو کوئی بحث تھی۔"

اس تقریر کو جب ہم مؤلّف کی ان عبارتوں کے ساتھ ملا کر پڑھتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ "رسول کا کام صرف پیغام الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس! رسول کی اطاعت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کا پیغام جو وہ لایا ہے اس پر عمل کیا جائے" اور یہ کہ " ہمارے رسولؐ صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مبلغ تھے" تو اس سے مؤلّف کا مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ بن عبد اللہ بحیثیت رسول

اور محمد بن عبداللہ بحیثیت انسان کے درمیان فرق کر دیں۔ رسول ہونے کی حیثیت سے آنحضرتؐ قرآن کی جو تعلیم دیں اور قرآن کے مطابق جو احکام دیں۔ وہ تو مؤلف کے نزدیک سمع وطاعت کے مستحق ہیں۔ مگر بحیثیت انسان آپ کے اقوال وافعال ویسے ہی ہیں جیسے ایک انسان کے ہوتے ہیں۔ ان کا خدا کی طرف سے ہونا اور ضلالت وگمراہی سے پاک ہونا مؤلف کے نزدیک مسلّم نہیں ہے۔ اور نہ جناب مؤلف ان کے اندر امتِ مسلمہ کے لیے کوئی قابل تقلید نمونہ پاتے ہیں۔

لیکن یہ تفریق جو انھوں نے محمد بن عبداللہ بحیثیت انسان اور محمد رسول اللہ بحیثیت مبلغ کے درمیان کی ہے، قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا، اسی حیثیت میں آپ مبلغ اور معلم بھی تھے، مربّی اور مزکّی بھی تھے، قاضی اور حاکم بھی تھے، امام اور امیر بھی تھے حتّی کہ آپ کی نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے اور ان تمام حیثیتوں میں آپ کی پاک زندگی ایک انسانِ کامل اور مسلم قانت اور مومن صادق کی زندگی کا ایسا نمونہ تھی جس کو حق تعالیٰ نے ہر اس شخص کے لیے بہترین قابل تقلید نمونہ قرار دیا تھا جو اللہ کی خوشنودی

اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہو۔
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ (احزاب ۳) قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ رسالت اور حیثیت انسانی اور حیثیتِ امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو اور یہ فرق کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جب آپ خدا کے رسول تھے تو لازم تھا کہ آپ کی پوری زندگی خدا کی شریعت کے ماتحت ہو اور اس شریعت کی نمائندہ ہو اور آپ سے کوئی ایسا فعل اور کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جو خدا کی رضا کے خلاف ہو۔

اسی بات کی طرف سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ:۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى — تمہارا صاحب یعنی محمدؐ نہ بدراہ ہوا نہ گمراہ ہوا۔"

"وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى" — اور جو کچھ کہتا ہے ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتا"

"اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى" — "اس کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔"

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى" — اس کو ایسے استاد نے تعلیم دی ہے جس کی قوتیں بڑی زبردست ہیں۔"

جناب مؤلف فرماتے ہیں کہ ان آیات میں محض قرآن کے وحی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کفار انکار کرتے ہیں۔ لیکن مجھے ان آیات میں کہیں کوئی خفیف سا اشارہ بھی قرآن کی طرف نظر نہیں آتا۔ اِنْ هُوَ اِلَّا

وَحْیٌ یُّوحیٰ ، میں ھُوَ کی ضمیر نطق رسول کی طرف پھرتی ہے جس کا ذکر وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَویٰ ۔ میں کیا گیا ہے ۔ ان آیات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر نطق رسول کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہے ۔ ہر وہ بات جس پر نطق رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے ۔ آیاتِ مذکورہ کی بنا پر وحی ہوگی اور ہوائے نفس سے پاک ہوگی ۔ یہ تصریح قرآن میں اسی لیے کی گئی ہے کہ رسول کو جن لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے ان کو رسول کے بدراہی اور گمراہی اور ہوائے نفس سے محفوظ ہونے کا کامل اطمینان ہوجائے اور وہ جان لیں کہ رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہے ، ورنہ اگر کسی ایک بات میں بھی یہ شبہ ہوجائے کہ وہ خواہش نفس پر مبنی ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہے تو رسول کی رسالت پر سے اعتماد اٹھ جائے ۔ کفار اسی چیز کے منکر تھے کہ رسول ؐ کو نعوذ باللہ جنون ہے ، یا کوئی آدمی اس کو پڑھاتا ہے ، یا وہ اپنے دل سے باتیں بنا کر کہتا ہے ۔ حق تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر اس غلط خیال کی تردید کی ہے ۔ اور صاف الفاظ میں فرما دیا ہے کہ نہ تمہارا صاحب بدراہ یا گمراہ ہے اور نہ خواہش نفس کی بنا پر کچھ کہتا ہے ، اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے جو خاص ہماری طرف سے ہے اور اس کو کوئی انسان یا جن یا شیطان نہیں پڑھاتا ، بلکہ وہ معلم سبق دیتا ہے جو شدید القویٰ ہے ۔ یہی بات خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمائی ہے کہ :۔

فوالذی نفسی بیدہٖ ما یخرج منہ الاحقًا۔

اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق ہی نکلتا ہے ۔

افسوس ہے کہ صاحب "تعلیماتِ قرآن"، کو اس حقیقت سے انکار ہے وہ فرماتے ہیں کہ :۔

"آنحضرت گھر میں از دواج مطہرات سے یا باہر دیگر حضرات سے جو گفتگو فرماتے تھے اس کے متعلق نہ وحی ہونے کا دعویٰ تھا نہ کفار کو کوئی بحث تھی :"

میں کہتا ہوں کہ آنحضرتؐ جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے ۔سب کچھ ضلالت و غوایت اور ہوائے نفس سے پاک تھا۔اللہ نے جو فطرتِ سلیمہ آپؐ کو عنایت فرمائی تھی اور تقویٰ و پاکیزگی کے جو حدود آپؐ کو بتائے تھے ،آپ کے تمام اقوال وافعال اسی فطرت سے صادر اور انہی حدود سے محدود ہوتے تھے ۔ان کے اندر تمام عالمِ انسانی کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ تھا اور ہم انہی سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز۔ کون سی چیز حرام ہے اور کون حلال ،کون سی باتیں حق تعالےٰ کی رضا کے مطابق ہیں اور کون سی اس کے خلاف ہیں ،کن امور میں ہم کو اجتہاد اور رائے کی آزادی حاصل ہے اور کن امور میں نہیں ہے ،کس طرح ہم . . . اطاعتِ امر کریں ،کس طرح شوریٰ سے معاملات طے کریں اور کیا معنی ہیں ہمارے دین میں جمہوریت کے ۔

۳ :۔ مؤلف کی تیسری بڑی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے رسول اللہ کی حیثیت امارت کو حیثیتِ رسالت سے الگ کر دیا ہے جس کا ثبوت قرآن میں نہیں ہے ۔وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"اطاعت بحیثیتِ رسول اور اطاعت بحیثیت امیر میں دو

باتوں کا فرق ہے :-

(۱) بحیثیت رسالت رسول اللہؐ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضۂ تبلیغ اللہ کی طرف سے آپ کے ذمہ لازم کیا گیا تھا :- یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المائدہ : ۱۰) اور امیر کی حیثیت سے لوگوں سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا تھا :- وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (آل عمران: ۱۷)

(۲) بحیثیت رسول آپ کی اطاعت قیامت تک فرض ہے کیوں کہ قرآن ہمیشہ کے لیے ہے - لیکن بحیثیت امیر آپ کی اطاعت بالمشافہ تھی :- یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (انفال: ۲۰) اور امارت کے فرائض ہمیشہ ہنگامی ہوں گے کیوں کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بدلتا رہتا ہے - ظاہر ہے کہ آج جو امیر ہوگا وہ غزوۂ بدر و اُحد کی متابعت میں صرف نیزہ و شمشیر سے جہاد میں کام نہ لے گا بلکہ موجودہ زمانے کے اسلحہ استعمال کرے گا - امراء کے مقابلہ میں منازعت کا حق حاصل ہے -

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء: ۸۰)

یہ سب کچھ قرآن کے منشاء کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ مؤلف نے یہ نہیں سمجھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کے بنائے ہوئے امیر نہیں تھے نہ خود بن گئے تھے بلکہ خدا کے مقرر کیے ہوئے امیر تھے۔ آپؐ کی امارت آپؐ کی رسالت سے الگ نہ تھی۔ دراصل آپؐ رسولِ خدا کی حیثیت ہی سے امیر تھے بلکہ صحیح یہ ہے کہ آپؐ امیر نہیں بلکہ مامور من اللہ تھے۔ مؤلف نے اسی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ اسی لیے رسول اللہؐ کی حیثیت امارت کو عام امراء کی سی حیثیت امارت سمجھ لیا۔

اپنے اس خیال کی تائید میں مؤلف نے قرآن کی جن آیات سے استدلال کیا ہے ان کو بھی وہ ٹھیک نہیں سمجھے ہیں۔ بلا شبہ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا مگر وہ اس لیے تھا کہ آپ اپنی امت کے لیے مشاورت کا نمونہ پیش کریں اور خود اپنے عمل سے جمہوریت (DEMOC R ACY) کے صحیح اصول کی طرف رہنمائی کریں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ آپ کی حیثیت دوسرے امراء کی سی ہے۔ دوسرے امراء کے لیے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مشورہ سے کام کریں۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸) اور یہ کہ اگر شوریٰ میں نزاع ہو تو وہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کریں۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء: ۵۹) لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جب آپ کسی چیز کا عزم فرمالیں تو خدا پر بھروسہ کر کے عمل کا اقدام فرمائیں فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران: ۱۵۹)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے، بلکہ آپ کو شوری کا حکم صرف اس لیے دیا گیا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرز حکومت کی بنیاد پڑ جائے۔

رہی یہ بات کہ امیر کی حیثیت سے آنحضرت صلعم کی اطاعت صرف آپ کے عہد تک تھی، تو یہ بھی غلط ہے کہ جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اس سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ۔ مؤلف نے۔ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ سے یہ سمجھا ہے کہ اطاعت رسول کا حکم صرف ان لوگوں کو دیا گیا تھا جو اس وقت اس حکم کو سن رہے تھے۔ لیکن اگر وہ سورۂ انفال کو ابتدا سے پڑھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ وہاں مقصود ہی کچھ اور ہے۔ ابتداء میں فرمایا گیا ہے کہ۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ہ" اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔" پھر ان لوگوں کو ڈانٹا گیا ہے جو رسول اللہ کی دعوتِ جہاد پر دلوں میں کڑھتے تھے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ۔

وَمَنْ یُّشَاقِقِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ہ (الانفال-۲)	اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول سے جھگڑا کرتا ہے اسے معلوم ہو جائے کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

اس کے بعد یہ ارشاد ہوا ہے :۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ہ (الانفال -۳)	اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور رسول کے حکم سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔

اس آیت میں اور پچھلی تمام آیات میں رسول کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا ذکر بار بار کیا گیا جس سے یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ پھر ہر جگہ لفظ رسول آیا ہے، امیر کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا گیا اور نہ کوئی مخفی سے مخفی اشارہ ایسا موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہاں رسول سے مراد رسول کی ایسی امیرانہ حیثیت ہے جو رسالت سے مختلف ہو پھر رسول کے حکم سے منہ موڑنے کو منع کیا گیا ہے جس پر سخت عذاب کی دھمکی اوپر دی جا چکی ہے اس کے بعد وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ کہنے کا منشاء صاف یہ ہے کہ تم ہمارے ان تاکیدی احکام کو سنتے ہوئے ہمارے رسول کی اطاعت سے کبھی منہ نہ موڑو، اس وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے۔ بلکہ قیامت تک جو لوگ ایمان کے ساتھ قرآن کو سنیں گے ان سب پر لازم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم ان کو پہونچے اس کے آگے سر تسلیم خم کریں۔

اور یہ جو مؤلف نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض امارت اسی طرح ہنگامی ہیں جس طرح دوسرے امراء کے ہوا کرتے ہیں۔ کیوں کہ آج ہم جہاد میں بدر و احد کی طرح نیزہ و شمشیر سے نہیں لڑ سکتے۔ تو یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں جن اسلحہ سے کام لیا وہ اسلحہ تو ضرور ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتے تھے لیکن حضورؐ نے اپنی لڑائیوں میں جو اخلاقی ضوابط برتے تھے اور جن ضوابط کو برتنے کی ہدایت فرمائی تھی وہ کسی عہد کے لیے مخصوص نہ تھے بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک

دائمی قانونِ جنگ بنا دیا ہے۔ شرعی نقطۂ نگاہ سے یہ سوال اہمیت نہیں رکھتا کہ آپ تلوار استعمال کرتے ہیں یا بندوق یا توپ، بلکہ اہمیت اس سوال کی ہے کہ آپ اپنے اسلحہ کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور کس طرح ان سے خونریزی کا کام لیتے ہیں۔ اس باب میں جو نمونہ آنحضرت صلعم نے اپنے غزوات میں پیش فرمایا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اسلامی جہاد کا ایک مکمل نمونہ ہے اور معنوی حیثیت سے سرور عالمؐ قیامت تک کے لیے ہر مسلمان فوج کے سپہ سالارِ اعظم ہیں۔

مؤلف نے امارت اور رسالت میں ایک فرق اور بھی بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے امراء سے نزاع اور اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے اب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امیرانہ حیثیت ویسی ہی ہے جیسی دوسرے امراء کی ہے تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کسی مسلمان کو نزاع کا حق حاصل تھا؟ جس امیر کے مقابلے میں آواز بلند کرنے تک کی اجازت نہ تھی اور جس کے مقابلہ میں محض اونچی آواز سے بولنے پر تمام عمر کے اعمال غارت ہو جانے کی دھمکی دی گئی تھی (حجرات۔ ۱) اور جس سے جھگڑا کرنے والے کو دوزخ میں جھونک دینے جانے کا خوف دلایا گیا تھا (النساء۔ ۱۱) کیا اس امیر سے منازعت کرنے کا حق کسی مسلمان کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کہاں اس امیر کی امارت اور کہاں ان امراء کی امارت جن سے منازعت کا حق مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

مؤلف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت امارت اور عام امراء کی حیثیتِ امارت میں قطعاً کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے حتیٰ کہ ان تمام احکام

کو جو اطاعت رسول سے متعلق ہیں۔ اطاعت امیر کے احکام قرار دے دیا ہے۔
صفحہ ۱۵۷ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

"اللہ اور رسول کے الفاظ قرآن میں اکثر جہاں جہاں ساتھ آئے ہیں ان سے مراد امارت ہے جس کا قانون کتاب اللہ ہے اور جس کے نافذ کرنے والے رسول اللہ یا ان کے جانشین ہیں۔ مثلاً: یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۝ (۸-۱) مال غنیمت کا حکم صرف عہد رسالت تک محدود نہ تھا بلکہ آئندہ کے لیے بھی ہے جس کی تعمیل خلافت کا فریضہ ہے۔"

پھر فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کے متعلق صفحہ ۱۵۸ پر حاشیہ لکھتے ہیں:۔

"آخری اختیار اللہ و رسول یعنی امارت ہے اس لیے رسول اللہ کا جو منصب بحیثیت امیر کے ہے وہی ان کے خلفاء کا بھی ہوگا۔"

یہ حق سے صریح تجاوز ہے۔ قرآن مجید میں اطاعت خدا، اطاعتِ رسول اور اطاعت اولی الامر کے تین مراتب بیان کیے گئے ہیں۔ اطاعتِ خدا سے مراد قرآن مجید کے احکام کی اطاعت ہے۔ اطاعت رسول سے مراد رسولِ مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل کی پیروی ہے اور اطاعت اولی الامر سے مراد مسلمانوں کے امراء اور ارباب حل وعقد کی اطاعت ہے۔ پہلے دونوں

مراتب کے متعلق قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ خدا اور رسول کے احکام میں کسی چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔ مسلمانوں کا کام سننا اور اطاعت کرنا ہے خدا اور رسول کے فیصلہ کے بعد کسی مسلمان کو یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرے۔ رہا تیسرا مرتبہ تو اس کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسول کے احکام کے تابع ہے اور نزاع کی صورت میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔ ایسے صاف اور کھلے ہوئے احکام کے موجود ہوتے ہوئے اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا اور رسول سے مراد امارت لی جائے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب امارت کو اس امارت کے ساتھ ملا دیا جائے جو مسلمانوں کے عام امراء کو حاصل ہے۔ اس معاملہ میں قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے "اموال غنیمت خدا اور رسول کے لیے ہیں" کہنے کا مدعا یہ ہے کہ خدا اور رسول نے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کیا ہے اس کے مصالح میں یہ غنائم صرف کیے جائیں اس سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد امارت ہے۔

حدیث کے متعلق مؤلف کا مسلک

حدیث کے متعلق مولف نے قریب قریب وہی مسلک اختیار کیا ہے جو منکرینِ حدیث کے ایک بڑے گروہ کا مسلک ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"تعلیم کتاب کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ رسول اس کے احکام پر عمل کرکے دکھا دے تاکہ امت اسی نمونہ پر عامل ہو جائے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ — تمہارے لیے رسول اللہ کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

چنانچہ ہمارے رسولؐ نے جملہ احکام قرآنی مثلاً نماز، روزہ، حج زکوٰۃ، وغیرہ پر عمل کرکے دکھلا دیا اور مسلمان اسی نمونہ پر عمل کرنے لگے۔ یہ اسوۂ حسنہ امت کے پاس عمل متواتر کی شکل میں موجود ہے جس کے مطابق رسولؐ اللہ کے عہد سے نسلاً بعد نسلٍ وہ عمل کرتی چلی آتی ہے۔ اس لیے یہ یقینی اور دینی ہے اس کی مخالفت خود قرآن کی مخالفت ہے"

دوسری جگہ مؤلف نے لکھا ہے:۔

"غیر یقینی شے کا دین میں کچھ دخل نہیں"

ان عبارات اور مؤلف کی ان تصریحات سے جو اوپر بیان ہو چکی ہیں ان کا مسلک واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ:۔

۱:۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عدالتی فیصلے اور وہ قوانین جو آپ نے سیاسی، جنگی اور تمدنی واجتماعی امور میں امیرِ قوم کی حیثیت سے نافذ کیے تھے اس اسوۂ رسول کی تعریف سے خارج ہیں جن کی پیروی کا حکم عام قرآن میں دیا گیا ہے۔ لہٰذا ان کی اب ضرورت نہیں رہی۔ کیوں کہ امارت کے فرائض ہنگامی ہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بدلتا رہتا ہے۔

۲:۔ صرف ان امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل (نہ کہ قول) قابلِ تقلید ہے جو عبادات اور دینی اعمال سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی احکام پر عملدرآمد کرنے کی صورت خود اپنے عمل سے بتادی ہے۔

۳:۔ مؤلف کے نزدیک صرف وہ عمل متواتر یقینی ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد سے اب تک جاری ہے۔ اور جس کی پیروی ہر نسل اپنے سے پہلی نسل کو دیکھ کر کرتی رہی ہے۔ رہیں وہ روایات جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال کے متعلق احادیث میں وارد ہوئی ہیں تو وہ یقینی نہیں ہے اور دین میں ان کا کچھ دخل نہیں ہے۔

ان میں سے پہلی دونوں باتوں کے متعلق میں قطعیت کے ساتھ کہتا ہوں کہ قرآن کے بالکل خلاف ہیں۔ قرآن میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر یہ حکم نکلتا ہو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے محض مذہبی اعمال ہی دائماً قابل تقلید ہیں۔ رہے تمدنی واجتماعی امور میں آپ کے فیصلے اور آپ کے نافذ کردہ قوانین، تو وہ صرف اس عہد کے لیے مخصوص تھے جس عہد میں وہ نافذ کیے گئے تھے۔ اگر ایسی کوئی آیت قران میں ہو جس سے ان دونوں قسم کے اعمال میں فرق کیا جا سکتا ہو۔ اور دونوں کے احکام مختلف قرار دیئے جا سکتے ہوں تو اس کو پیش کیا جائے۔ مجھ کو تو قرآن میں صاف حکم یہ ملتا ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ	کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر میں فیصلہ کر دے تو ان کو اپنے معاملہ

لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ط وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ہ (احزاب ۵)	میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوگا۔

اس آیت میں زمانہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مومن اور مومنہ سے خاص عہد رسالت کے مومن مرد و عورت مراد نہیں لیے جا سکتے۔ اَمْرًا کا لفظ نہایت عام ہے جو ہر قسم کے معاملات پر حاوی ہے۔ خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی اللہ اور رسول سے مراد اللہ اور رسول ہی ہیں "امارت" ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ امیر یا اولی الامر بہر حال مومن ہی ہوں گے اور یہاں تمام مومنین و مومنات سے یہ حق سلب کر لیا گیا ہے کہ خدا اور رسول نے جس معاملہ کا فیصلہ کر دیا ہو اس میں انھیں مجتمعاً یا منفرداً خود فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار باقی رہے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ "جو اس کے خلاف عمل کرے گا وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوگا"۔ یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس کی ہدایت سے اس کے رسول نے اپنے احکام اور اپنے قوانین سے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کر دیا ہے اس کا قیام منحصر ہی اس پر ہے کہ جو احکام جاری کر دیئے گئے ہیں اور جو قوانین نافذ کر دیئے گئے ہیں ان کی ٹھیک ٹھیک پیروی کی جائے۔ اگر خدا اور اس کے رسول کی قولی و عملی رہنمائی سے قطع نظر کر کے لوگ خود اپنی رائے اور اپنے اختیار سے کچھ طریقے اختیار کریں گے تو یہ نظام باقی نہ رہے گا اور اس نظام کے ٹوٹتے ہی تم راہ راست سے بھٹک کر بہت دور نکل جاؤ گے۔ تعجب ہے کہ جس قرآن

میں ایسی صاف اور صریح ہدایت موجود ہے۔ اس کی تعلیمات لکھنے والے نے وہ مسلک اختیار کیا ہے جو آپ ابھی سن آئے ہیں۔

رہی تیسری بات تو اس کے متعلق میں نے اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ اپنے مضمون "حدیث اور قرآن" میں بیان کیے ہیں۔ اس لیے یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ میں جناب مؤلف سے صرف یہ سوال کروں گا کہ اگر کوئی شخص ان تمام بدعات وخرافات کو جو آج مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں رائج ہو گئی ہیں وہ "یقینی عمل متواتر" قرار دے۔ جو رسول اللہ کے عہد سے نسلاً بعد نسلٍ چلا آرہا ہے۔ اور اس بنا پر انھیں داخل دین سمجھے تو آپ کے پاس کون سا ایسا یقینی ذریعہ ہے جس سے آپ یہ فیصلہ کرسکیں گے کہ یہ عمل رسول اللہ کا نہیں ہے بلکہ بعد کے لوگوں کی ایجاد ہے؟ آپ فرمائیں گے کہ ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کریں گے اور اس کی آیات سے ان بدعات کی تردید کر دیں گے مگر میں کہتا ہوں کہ اول تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل سے آیات قرآنی کے معانی کی جو تعین ہوتی ہے اس کو نظر انداز کرنے کے بعد آیات کی تاویل میں ایک بدعت پسند انسان اتنی گنجائش نکال سکتا ہے کہ اس کی بہت سی بدعتوں کی تردید مشکل ہو جائے گی۔ دوسرے اگر آپ نے قرآن سے اس کی بدعات کی تردید کر بھی دی تو یہ اس کے اس دعوے کی تردید نہ ہوگی کہ یہ وہی یقینی عمل مواتر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے نسلاً بعد نسلٍ چلا آرہا ہے۔ آپ اپنے مسلک کے مطابق اس عمل متواتر کو غیر یقینی کہہ نہیں سکتے اور آپ تاریخ سے بھی (جو روایات کی طرح غیر یقینی ہی ہونی چاہیئے)

یہ استدلال نہیں کر سکتے کہ یہ بدعات عہد رسالت میں نہ تھیں ۔ بلکہ فلاں عہد میں جاری ہوئیں ۔ اب صرف یہی صورت رہ جاتی ہے کہ آپ ان کو یقینی مان لیں ۔ پھر یا تو ان کی پیروی کریں یا یہ فیصلہ کر دیں کہ عمل رسول تعلیم قران کے خلاف تھا ۔ معلوم نہیں کہ فاضل مؤلف اور ان کے ہم خیال حضرات کے پاس اس پیچیدگی کا کیا حل ہے ۔ ؟ (ترجمان القرآن رجب ۵۳ھ، اکتوبر ۳۴ء)

رسالت اور اس کے احکام

میرے مضمون "اتباع و اطاعتِ رسول ﷺ" کو دیکھ کر میرے دوست چودھری غلام احمد پرویز صاحب نے اپنے ایک طویل مراسلہ میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے :۔

"۔۔ لیکن مجھے آپ کی وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی کی تفسیر سے کچھ اختلاف ہے۔ آپ نے لکھا ہے۔

"جس وقت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت پر سرفراز کیا اس وقت سے لے کر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا"

پھر دوسری جگہ آپ لکھتے ہیں :۔

"آنحضرت ﷺ جس وقت جس حال میں جو کچھ کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے"

اس سے مقصد واضح ہے کہ حضورؐ کا ہر فعل اور ہر قول من جانب اللہ ہوتا تھا اور بحیثیت رسول صادر فرمانے کی بنا پر امّت مسلمہ کے لیے واجب الاطاعت۔

اس کے متعلق یہاں صرف دو ایک اشاروں پر اکتفا کروں گا پہلے تو قرآن کریم کو لیجئے۔ آپ کو متعدد ایسے امور ملیں گے جن میں حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تہدید و تادیب ہوئی ہے۔ مثلاً آپ نے ایک قسم کا شہد کھانے سے قسم کھالی تو ارشاد ہوا۔

يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (تحریم)	اے نبی جس کو اللہ نے تمھارے لیے حلال کیا ہے اسے تم حرام کیوں کرتے ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کا شہد کو اپنے اوپر حرام کر لینا خدا کی جانب سے تھا تو خدا اس پر معترض کیوں ہوا۔؟

دوسری جگہ ہے۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (توبہ)	اے نبی خدا نے تم سے درگذر کیا تم نے انھیں کیوں اجازت دیدی تھی؟

اب اگر حضورؐ کا اجازت دیدینا از روئے وحی تھا اور یہ فعل خدا کے رسول کی حیثیت سے تھا تو اس پر وحی بھیجنے والے نے تہدید کس لیے فرمائی؟

اسی طرح عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (عبس)

اگر حضور کا پیشانی پر بل لے آنا بحیثیت رسول تھا تو قرآن کریم میں اس پر تنبیہ کیوں آئی۔؟

ان تصریحات سے صاف ظاہر ہے کہ حضورؐ کے یہ افعال و اقوال بحیثیت رسول نہ تھے بلکہ ذاتی حیثیت سے تھے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ امور ضلالت و غوایت اور ہوائے نفس کی بنا پر تھے بلکہ یہ کہ امور دنیاوی میں بہ حیثیت بشر خاصہ بشریت حضورؐ کے ساتھ تھا۔ جس میں ایسے معمولی سہو کوئی معنیٰ نہیں رکھتے اور اس سے حضورؐ کے خلق عظیم اور قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے لیے دشمنانِ اسلام کے لیے زندہ شہادت ملتی ہے۔ اب اس کی شہادت خود احادیث سے بھی ملتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک باب اس عنوان سے لکھا ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ جو کچھ آنحضرتؐ سے مروی ہے اور کتب احادیث میں مدوّن ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔
ایک تو وہ امور جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ امور جن کو تبلیغ رسالت سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی کی نسبت حضورؐ نے فرمایا ہے۔

انما انا بشر مثلکم اذا امرتکم بشیئ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیئ من رأیی فانما انا بشر۔	میں ایک انسان ہوں جب تم سے کوئی مذہبی امر بیان کروں تو اس کو اختیار کرو اور جو بات میں اپنی رائے سے کہوں تو میں ایک انسان ہوں۔

اسی بنا پر درخت خرما کے گابھا لگانے کے مشہور واقعہ کے بعد حضورؐ نے فرمایا تھا:۔

انی ظننت ظنا ولا تواخذونی	میں نے صرف ایسا گمان کیا تھا
بالظن ولکن اذا	تخمینی بات کا مجھ سے مواخذہ نہ
حدثتکم من اللّٰہ	کرو لیکن میں خدا کی جانب سے
بشیئ فخذوا بہ فانی	کوئی بات بیان کروں تو ان کو
لم اکذب علی اللّٰہ۔	اختیار کرو۔ اس لیے کہ میں خدا
	پر جھوٹ نہیں باندھتا۔

چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں وہ امور ہیں جنھیں حضورؐ عادۃً کیا کرتے تھے یا اتفاقیہ بلا قصد یا بہ سبیل تذکرہ بیان فرماتے ہیں اور اس کے بعد وہ ان مواقع و امور کی مثالیں بھی بیان فرماتے ہیں۔ ان ہی میں وہ ان امور کو بھی لیتے ہیں جو حضورؐ کے عہد میں ایک جزئی مصلحت رکھتے تھے۔ لیکن وہ تمام امّت کے لیے حتمی اور لازمی نہ تھے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ آپ دین کے متعلق فرماتے تھے وہی بحیثیت رسول ہوتا تھا اور خواہ وہ وحیٔ منزل ہو یا اجتہادِ رسولؐ۔ اور وہی امّت کے لیے واجب الاتباع تھا اور اس کے علاوہ جو باتیں بحیثیت بشر فرماتے۔ ان میں یہ قید نہ تھی یہی وجہ تھی کہ بعض امورِ مشاورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ نے رائے بھی

پیش کی اور وہ اختیار بھی کی گئی یہی نہیں حضورؐ کی ایسی رائے کے خلاف عمل بھی تھا۔ چنانچہ قرآن شاہد ہے کہ آپؐ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ "امسك عليك زوجك"، لیکن انھوں نے حضرت زینبؓ کو طلاق دیدی۔ کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ بحیثیتِ رسول آپؐ کا فرمان ہوتا اور حضرت زیدؓ اس کی خلاف ورزی کرتے؟ کتب احادیث میں کئی ایسے واقعات مذکور ہیں جن میں حضور نے کوئی ارشاد فرمایا اور صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ حکم بحیثیت رسول ارشاد فرما رہے ہیں یا بطور اپنی رائے کے۔؟ چنانچہ جنگ بدر میں آپ ایک مقام پر کیمپ نصب فرمانا چاہتے تھے تو ایک صحابی نے یہی سوال کیا اور جب معلوم ہوا کہ حضورؐ اپنی رائے سے ایسا فرما رہے ہیں تو انھوں نے با ادب گذارش کیا کہ اگر حضور ذرا آگے جا کر خیمہ زن ہوں تو زیادہ قرینِ مصلحت ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

ان تصریحات سے ثابت ہوا کہ حضورؐ ہر آن اور ہر حال میں رسول نہیں ہوتے تھے۔ اور آپ کا ہر قول اور ہر فعل بہ حیثیت رسول ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہاں جو مردِ خدا محبوب کے رنگ میں رنگا جانا چاہے اس کی بات بالکل جُدا ہے۔ لیکن اس شکل اور وجوب کی صورت میں بڑا فرق ہے۔

اگرچہ شاہ صاحب نے حضورؐ کے فیصلے بھی اسی ذیل میں رکھے ہیں جو رسالت کی حیثیت لیے ہوئے نہ تھے (غالباً ان کی مراد

وقتی فیصلوں سے ہوگی ۔) اور صاحب "تعلیمات" نے بھی امارت کو جو رسالت سے الگ کیا ہے تو غالباً اسی بنا پر۔ لیکن میں تو حضورؐ کے قضایا متعلقہ دین کو عین تبلیغ رسالت میں ہی سمجھتا ہوں اور واجب الاتباع۔ البتہ ایک اور چیز ہے جو امارت و رسالت کی بحث میں میرے سامنے آگئی ہے اور اگرچہ صاحبِ تعلیمات نے اس پر بوضوح روشنی نہیں ڈالی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شاید منشا یہی ہے جو میرے ذہن میں آیا ہے۔ جہاں تک نبیؐ کریم کا تعلق ہے۔ امور دین میں حضورؐ کی اطاعت کیا بحیثیتِ رسول اور کیا بحیثیت امیر قیامت تک کے لیے ہے۔ اس میں نہ اس وقت کسی کو منازعت کا حق تھا نہ آج ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد قرآن کریم نے جہاں خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے تو اسلامی نظام کے بقاد کے لیے یہ تو ضروری ہے کہ کوئی ایسی سند (AUTHORITY) ہو جو یہ بتا سکے کہ خدا و رسول کا اس بارے میں یہی فیصلہ ہے۔ یا وقتی امور میں ایسا ہی فیصلہ خود صادر کر سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر خلیفہ برحق ہو اور اس کے ساتھ اس کی مجلسِ شوریٰ (صحیح طریق پر منتخب شدہ) کام کر رہی ہو تو یہی جماعت یعنی "خلیفہ ان کونسل" (KHALIFA-IN-COUNCIL) ہی وہ آخری سند (AUTHORIT) ہوگی جو امتِ مسلمہ کے لیے "خدا اور رسول" کی نمائندگی کرے گی

یعنی اس مجلس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ اور کسی شخص کو اس کے
خلاف منازعت کا حق نہ ہوگا۔ ورنہ اگر ہر شخص کو اختیار دے دیا
جائے کہ وہ "فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" کا فریضہ
خود ہی سرانجام دے لے تو ظاہر ہے کہ نظام اسلام کسی طرح بھی
قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی مجلس اعلیٰ (SUPREME COUNCIL)
ہوگی جس کے قضایا کی پھر کہیں اپیل نہ ہوگی۔ اور یہی جماعت فقہ
مرتب کرنے کا کام کرے گی۔ البتہ جب اس جماعت کا کوئی
رکن کتاب و سنت کے خلاف فیصلے صادر کرے تو جمہور کو
اختیار ہوگا کہ انھیں برطرف کر کے ان کی جگہ دوسرا انتخاب
عمل میں لے آئیں۔ کیونکہ یہاں ایسے اولی الامر سے منازعت
کا حق حاصل ہو جائے گا جو امت کو خدا اور رسول کی اطاعت
کی طرف نہیں لے جاتے۔ لیکن انفرادی طور پر کسی کو حق نہ ہوگا
کہ ان کے فیصلوں سے اس بنا پر سرتابی شروع کر دے کہ وہ
اس کے اپنے خیال میں کتاب و سنت کے خلاف ہیں۔ یہی وہ
بااختیار جماعت ہوگی جو وقتی امور میں بنابر مصلحت کسی سابقہ
وقتی فیصلے یا انتظام کے خلاف بھی فیصلہ کر سکے گی۔ جیسا کہ
بہ کثرت احادیث سے ظاہر ہے۔ حضور نے نجران کے
عیسائیوں اور خیبر کے یہود کو اپنی اپنی جگہ رہنے دیا۔ لیکن حضرت عمرؓ
نے اپنے عہد خلافت میں بنابر مصلحت وقت ان کو وہاں سے

نکال دیا۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات خلیفہ وقت (مثلاً حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ) بھی عدالتوں میں بحیثیت مدعا علیہ پیش ہوا کرتے تھے جس سے ظاہر ہے کہ خلیفہ کے خلاف بھی ہر شخص کو منازعت کا حق حاصل ہے، تو واضح رہے کہ یہ لوگ خلیفہ اور اس کی ذاتی حیثیت (PERSONAL CAPACITY) میں فرق نہیں کرتے۔ عدالتوں میں حضرت عمرؓ بن الخطاب اور علیؓ بن ابی طالب پیش ہوتے تھے اور دعاوی ان کی ذات کے خلاف تھے۔ نہ کہ "خلیفہ ان کونسل" کے خلاف۔ اور یہ اسلامی نظامِ حکومت کا طغرائے امتیاز ہے کہ اس نے قانون کو رائج کرنے والوں کو بھی قانون کی زد سے مستثنیٰ نہیں کیا پھر یہ بھی واضح رہے کہ "خلیفہ ان کونسل" کی حیثیت بھی واضع قانون کی نہیں ہوگی بلکہ جہاں تک اصولِ قانون کا تعلق ہے وہ تو کتاب وسنّت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منضبط ہو چکے۔ اب ان اصول کو نافذ کرنا یا ان کی روشنی میں جزئی امور میں قواعد مرتب کرنا یہ اس مجلس کا فریضہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ صاحب "تعلیمات" نے جہاں یہ لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں اطاعت خدا اور رسول کا حکم آیا ہے اس سے مراد امارت ہے۔ ان کے پیش نظر یہی خاکہ ہے جو اوپر گذارش کیا گیا ہے۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو اس میں کسی [illegible] کہ اس بااختیار جماعت

کی اطاعت عین اطاعت رسولؐ ہے اور اس کی معصیت معصیتِ خدا و رسول جیسا کہ نبیؐ اکرم نے خود ارشاد فرمایا کہ :۔

من یطع الامیر فقد	جس شخص نے امیر کی اطاعت
اطاعنی ومن عصی	کی اس نے میری اطاعت کی اور
الامیر فقد عصانی	جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے
	میری نافرمانی کی۔

بحث طویل ہو گئی۔ لیکن امید ہے کہ اس میں بہت سی کام کی باتیں نکل آئیں گی۔ آخر میں اتنا گذارش کرنا ضروری ہے کہ چونکہ میں نے اس میں آپ کو مخاطب کیا ہے اس لیے وہی امور پیش کیے ہیں جن میں مجھے آپ کے جواب کے بعد مزید اطمینان کی ضرورت نظر آئی۔ رہے وہ امور جن سے اتفاق ہے یا صاحب "تعلیمات" سے جن امور میں اختلاف ہے انھیں دہرانا تحصیل حاصل سمجھا گیا ہے۔ اور یہ گذارشات بھی محض لیطمئن قلبی ہیں ــــــ"

اطاعتِ رسول کے مسئلہ میں یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ کوئی رسول اپنی ذاتی حیثیت میں مطاع اور متبوع نہیں ہو سکتا۔ نہ موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت اور پیروی اس بنا پر ہے کہ وہ موسیٰ بن عمران ہیں۔ نہ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام اس وجہ سے لائق اطاعت واتباع ہیں کہ وہ عیسیٰ بن مریم ہیں اور نہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اس حیثیت سے لازم ہے کہ آپ محمد بن عبد اللہ ہیں

اطاعت اور پیروی جو کچھ بھی ہے صرف اس حیثیت سے ہے کہ یہ حضرات اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ نے ان کو وہ علمِ حق عطا کیا جو عام انسانوں کو عطا نہیں کیا اور ان کو وہ ہدایت بخشی جو عام لوگوں کو نہیں بخشی اور ان کو دنیا میں اپنی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کے وہ صحیح طریقے بتائے جن کو عام لوگ اپنی عقل ورائے یا انبیاء کے سوا دوسرے لوگوں کی رہنمائی سے معلوم نہیں کر سکتے۔ اب اختلاف جس امر میں واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول کی اطاعت اور پیروی کس امر میں ہے اور کس حد تک ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ اطاعت اور پیروی صرف اس کتاب کی ہے جو اللہ کی طرف سے اس کا رسول لے کر آتا ہے۔ تبلیغ کتاب کے بعد رسول کی حیثیتِ رسالت ختم ہو جاتی ہے پھر وہ بھی ایسا ہی ایک انسان ہے جیسے اور دوسرے انسان ہیں۔ دوسرے انسان اگر امیر اور سردار قوم ہوں تو محض نظم وضبط (DISCIPLINE) کے لیے ان کی اطاعت لازم ہوگی۔ مگر مذہبی فریضہ نہ ہوگی۔ دوسرے اگر عالم، حکیم اور متقی ہوں تو ان کے اوصاف (MERITS) کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی پیروی کی جائے گی اور یہ پیروی اختیاری ہوگی، واجب نہ ہوگی۔ یہی معاملہ رسول خدا کا بھی ہے۔ تبلیغ کتاب کے سوا دوسرے تمام معاملات میں رسول کی حیثیت محض شخصی ہے۔ بحیثیت ایک شخص کے اگر وہ امیر ہے تو اس کی اطاعت بالمنافہ ہے نہ کہ دائمی۔ اگر وہ قاضی ہے تو اس کے فیصلے وہیں تک نافذ ہوں گے جہاں تک اسکے حدودِ قضا (JURISDICTION) ہیں۔ ان سے باہر زیادہ سے زیادہ ایک فاضل جج کی حیثیت سے اس کے فیصلے بطورِ ایک نظیر کے لیے جائیں گے۔ نہ کہ ایک شارع اور واضع قانون کی حیثیت سے اگر وہ حکیم ہے تو اس کی زبان سے جو حکمت اور اخلاق کی باتیں نکلیں گی وہ اپنی قدرو

قیمت کے لحاظ سے قبول کی جائیں گی جس طرح دوسرے علماء وعقلاء کی ایسی ہی باتیں قبول کی جاتی ہیں۔ محض اس بنا پر کہ وہ حامل منصب رسالت کی زبان سے نکلی ہیں وہ داخل دین نہیں سمجھی جائیں گی۔ اسی طرح اگر وہ ایک نیک سیرت انسان ہے اور اس کی زندگی اپنے اطوار، آداب اور معاملات کے اعتبار سے ایک بہترین زندگی ہے تو ہم بالاختیار اس کو ایک نمونہ (MODEL) بنائیں گے جس طرح ایک غیر نبی کو نمونہ قرار دینے میں ہم مختار ہیں لیکن اس کا کوئی قول اور عمل ہمارے لیے اخلاق، معاشرت، معیشت اور معاملات میں ایسا قانون نہ ہوگا جس کی پیروی ہم پر واجب ہو۔ یہ مذہب اس گروہ کا ہے جو آجکل اہل قرآن کہلاتا ہے۔

ایک دوسرا گروہ اس خیال میں تھوڑی سی ترمیم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رسول کے ذمہ صرف کتاب پہنچا دینا ہی نہ تھا بلکہ کتاب کے احکام پر عمل کر کے دکھا دینا بھی تھا کہ امت اسی نمونہ پر عامل ہو۔ لہٰذا عبادات وطاعات وغیرہ کے متعلق احکام کتاب کی جو تفصیلی عملی صورت رسول نے بتائی ہے اس کی پیروی بھی کتاب ہی کی پیروی ہے۔ اور دینی فرض ہے۔ باقی رہے وہ معاملات جو احکام کتاب کے علاوہ رسول اپنی شخصی حیثیت میں ایک امیر، ایک قاضی، ایک مصلح قوم، ایک حکیم، ایک شہری اور ایک فرد جماعت کی حیثیت سے انجام دے تو ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ایک دائمی اور عالمگیر ضابطہ وقانون بنانے والی ہو اور جس کی پیروی ہمیشہ کے لیے ایک دینی فرض ہو۔ اس گروہ کے نمائندے جناب مولانا اسلم جیراجپوری ہیں۔

ایک تیسرا گروہ ہے جو رسول کی حیثیت رسالت کو اس کی زندگی کے ایک

بہت بڑے حصہ پر حاوی سمجھتا ہے۔ اخلاق، معاشرت، معالات، احکام وقضایا اور بہت سے دوسرے معالات میں اس کے قول اور فعل کا خدا کی جانب سے مولانا تسلیم کرتا ہے۔ اور یہ بھی مانتا ہے کہ یہ سب چیزیں امت کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔ مگر وہ حیثیتِ رسالت اور حیثیت شخصی میں فرق ضرور کرتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ رسول کی زندگی کے کچھ معاملات ایسے ضرور ہیں جو حیثیتِ رسالت سے خارج ہیں اور قابلِ تقلید نمونہ نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ کوئی ایسا واضح خط نہیں کھینچ سکتا جو حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ شخصی میں بیّن امتیاز کر دیتا ہو۔ اور ایک ایسی حد مقرر کرتا ہو جہاں پہنچ کر رسول کی حیثیت محض ایک انسان کی رہ جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چودھری صاحب؎ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور میں ابتداء ہی میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان کا مسلک مقدم الذکر دونوں گروہوں کی بہ نسبت حق سے بہت زیادہ قریب ہے اگرچہ کھتوڑی غلطی اس میں ضرور ہے لیکن الحمدللہ کہ وہ گمراہی کی حد تک نہیں پہنچتی۔

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ رسول کی حیثیت شخصی اور حیثیت رسالت اگرچہ اعتبار میں دو جداگانہ حیثیتیں ہیں مگر وجود میں دونوں ایک ہی ہیں اور ان کے درمیان عملاً کوئی فرق کرنا ممکن نہیں ہے۔ منصبِ رسالت دنیوی عہدوں کی طرح نہیں ہے کہ عہدہ دار جب تک اپنے عہدہ کی کرسی پر بیٹھا ہے، عہدہ دار ہے اور جب اس سے اترا تو ایک عام انسان ہے بلکہ رسول جس وقت منصب رسالت پر

؎ پرویز صاحب کے یہ خیالات ۱۹۳۵ء میں تھے۔ اب ترقی کر کے پہلے گروہ کی رہنمائی کر رہے ہیں (مرتب)

سرفراز ہوتا ہے اس وقت سے مرتے دم تک وہ ہر وقت اور ہر آن مامور (ON DUTY) ہوتا ہے اور وہ کوئی فعل ایسا نہیں کرسکتا جو اس سلطنت کی پالیسی کے خلاف ہو جس کا وہ نمائندہ بنا کر بھیجا گیا ہے اس کی زندگی کے معاملات عام اس سے کہ وہ امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی حیثیت سے، قاضی کی حیثیت سے ہوں یا معلمِ اخلاق کی حیثیت سے، ایک شہری اور سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوں، یا ایک شوہر، باپ، بھائی، رشتہ دار اور دوست کی حیثیت سے۔ سب پر اس کی حیثیتِ رسالت اس طرح حاوی ہوتی ہے کہ اس کی ذمہ داریاں کسی حال میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے منفک نہیں ہوتیں حتیٰ کہ جب وہ اپنی خلوت میں اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہے۔ اس وقت بھی وہ اسی طرح اللہ کا رسول ہوتا ہے جس طرح وہ مسجد میں نماز پڑھاتے وقت ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کی ہدایت کے تحت کرتا ہے۔ اس پر ہر آن اللہ کی طرف سے سخت نگرانی قائم رہتی ہے جس کے ماتحت وہ انہی حدود کے اندر چلنے پر مجبور ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں اور اپنے اقوال میں، اعمال میں اور زندگی کے پورے رویے میں دنیا کے سامنے اس امر کا مظاہرہ کرتا ہے کہ یہ ہیں وہ اصول جن پر انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام قائم ہونا چاہیے اور یہ ہیں وہ حدود جن کے دائرے میں انسان کی آزادیٔ عمل کو محدود ہونا چاہیے، اس خدمت کو نبی اپنی شخصی و خانگی زندگی میں بھی اسی طرح سرانجام دیتا رہتا ہے جس طرح اپنی سرکاری حیثیت میں۔ اور کسی معاملہ میں بھی اگر اس کے قدم کو ذرا سی لغزش ہو جاتی ہے تو اس کو فوراً تنبیہ کی جاتی ہے کیونکہ اس کی خدمت صرف اسی کی

خطا نہیں ہے بلکہ ایک پوری امت کی خطا ہے۔ اس کو بھیجنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر کے انکے سامنے ایک "مسلم" کی زندگی کا مکمل نمونہ پیش کر دے۔ اور صرف یہی نہیں کہ انفرادی معاملات میں ان کی رہنمائی کر کے ان کو فرداً فرداً مسلمان بنائے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسلام کا تمدنی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظام قائم کر کے صحیح معنوں میں ایک مسلم سوسائٹی بھی وجود میں لے آئے۔ لہذا اس کا خطا اور غلطی سے محفوظ ہونا لازم ہے تاکہ کامل اعتماد کے ساتھ اس کی پیروی کی جا سکے اور اس کے قول و فعل کو بالکلیہ اسلام کی تعلیم اور اسلامیت کا معیار قرار دیا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ نبی کے اقوال و افعال میں تقلید و تاسّی کے لحاظ سے فرق مراتب ضرور ہے۔ بعض وجوب اور فرضیت کے درجہ میں ہیں، بعض استحباب کے درجہ میں اور بعض ایسے ہیں جن کی حیثیت درجہ استکمال کی ہے۔ لیکن فی الجملہ نبی کی پوری زندگی ایک ایسا نمونہ (MODEL) ہے جس کو اسی لیے پیش کیا گیا ہے کہ بنی آدم اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کوشش کریں۔ جو شخص اس نمونہ کی مطابقت میں جتنا بڑھا ہوا ہوگا وہ اتنا ہی کامل انسان اور مسلمان ہوگا اور جو اس کی مطابقت کے کم از کم ناگزیر مرتبہ سے بھی گھٹ جائے گا وہ اپنی کوتاہی کے لحاظ سے فاسق، فاجر، گمراہ اور مغضوب ہوگا۔

میرے نزدیک یہی آخری گروہ حق پر ہے اور میں قرآن اور عقل کی روشنی میں جتنا زیادہ غور کرتا ہوں اس مسلک کی حقانیت پر میرا یقین بڑھتا جاتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کے جو حالات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں ان کو

دیکھنے سے مجھ کو نبوت کی حقیقت یہ نہیں معلوم ہوتی کہ اللہ تعالیٰ یکایک کسی راہ چلتے
کو پکڑ کر اپنی کتاب پہونچانے کے لئے مامور کر دیتا ہو یا کسی شخص کو اس طور پر
اپنی پیغام بری کے لئے مقرر کرتا ہو کہ وہ منجملہ اپنے دوسرے کاروبار کے
ایک پیغمبری کا کام بھی انجام دے دیا کرے۔ گویا کہ وہ ایک وقتی مزدور
(PART TIME WORKER) ہے جو مقرر اوقات میں ایک مقرر کام کر دیتا ہے
اور اس کام کو ختم کر دینے کے بعد آزاد ہوتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ برعکس
اس کے میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جب کسی قوم میں نبی بھیجنا چاہا ہے تو خاص
طور پر ایک شخص کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ نبوت کی خدمت انجام دے۔
اس کے اندر انسانیت کی وہ بلند ترین صفات اور وہ اعلیٰ درجہ کی ذہنی اور
روحانی قوتیں ودیعت کی ہیں جو اس اہم ترین منصب کو سنبھالنے کے لیے ضروری
ہیں۔ پیدائش کے وقت سے خاص اپنی نگرانی میں اس کی پرورش اور تربیت
کرائی ہے۔ نبوت عطا کرنے سے پہلے بھی اس کو اخلاقی عیوب اور گمراہیوں
اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھا ہے۔ خطرات اور مہلکوں سے اس کو بچایا ہے
اور ایسے حالات میں اس کی پرورش کی ہے جن میں اس کی استعدادِ نبوت ترقی
کر کے فعلیت کی طرف بڑھتی رہی ہے۔ پھر جب وہ اپنے کمال کو پہونچ گیا ہے تو
اسکو خاص اپنے پاس سے علم اور قوت فیصلہ (JUDGMENT) اور نورِ ہدایت عطا
کر کے منصب نبوت پر مامور کیا ہے اور اس سے اس طرح یہ کام لیا ہے کہ
اس منصب پر آنے کے بعد سے آخری سانس تک اس کی پوری زندگی اسی
کام کے لیے وقف رہی ہے۔ اس کے لیے دنیا میں تلاوتِ آیات اور تعلیم

کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفوس کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں رہا ہے۔ رات دن. اُٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے اس کو یہی دھن رہی ہے کہ گمراہوں کو راہِ راست پر لائے اور راہِ راست پر آجانے والوں کو ترقی کی اعلیٰ منزلوں پر جاتے کے قابل بنائے۔ وہ ہمیشہ ایک ہمہ وقتی ملازم (WHOLETIME SERVANT) رہا ہے جس کو کبھی چھٹی نہیں ملی اور نہ اس کے لیے کبھی اوقاتِ کار (WORKING HOURS) مقرر کیے گیے۔ اس پر خدا کی طرف سے شدید نگرانی قائم رہی ہے کہ خطا نہ کرنے پائے، ہوائے نفس کے اتباع اور شیطانی وساوس سے اس کی سخت حفاظت کی گئی ہے، معاملات کو بالکل اس کی بشری عقل اور اس کے انسانی اجتہاد پر نہیں چھوڑ دیا گیا۔ بلکہ جہاں بھی اس کی خواہش یا اس کے اجتہاد نے خدا کے مقرر کیے ہوئے خطِ مستقیم سے بال برابر جنبش کی ہے وہیں اس کو ٹوک کر سیدھا کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی پیدائش اور اس کی بعثت کا مقصد ہی یہ رہا ہے کہ خدا کے بندوں کو سواء السبیل اور صراطِ مستقیم پر چلائے۔ اگر وہ اس خط سے یک سرِ مو بھی ہٹتا تو عام انسان میلوں اس سے دور نکل جاتے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کے لفظ لفظ پر قرآن گواہ ہے۔

(۱) یہ بات کہ انبیاء علیہم السّلام پیدائش سے پہلے ہی نبوت کے لیے نامزد کر دیئے جاتے تھے اور ان کو خاص طور پر اسی منصب کے لیے پیدا کیا جاتا تھا متعدد انبیاء کے احوال سے معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش سے پہلے ہی حضرت ابراہیمؑ کو ان کی پیدائش اور نبوت کی خوشخبری دیدی جاتی ہے:۔ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ وَبٰرَكْنَا عَلَیْهِ وَعَلٰۤى اِسْحٰقَ (الصّٰفّٰت ـ ۳) حضرت یوسفؑ کے متعلق بچپن ہی سے حضرت

یعقوبؑ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو برگزیدہ کرنے اور ابراہیم و اسحٰق علیہما السلام کی طرح ان پر اپنی نعمت کا اتمام کرنے والا ہے۔ حضرت زکریاؑ بیٹے کے لیے دعا کرتے ہیں کہ ان حضرت یحییٰؑ کی خوشخبری ان الفاظ میں دی جاتی ہے کہ :- اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰہِ وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (آل عمران ۴) حضرت مریم کے پاس خاص طور پر فرشتہ بھیجا جاتا ہے کہ ان کو ایک پاک طینت لڑکے (غلام زکی) کی خوشخبری دے۔ اور جب ان کے وضع حمل کا وقت آتا ہے تو خاص حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی زچگی کے انتظامات ہوتے ہیں (ملاحظہ ہو سورۂ مریم رکوع دوم) پھر اس اسرائیلی چرواہے کو بھی دیکھئے جس سے وادی مقدس طویٰ میں بلا کر باتیں کی گئیں۔ وہ بھی عام چرواہوں کی طرح نہ تھا۔ اسے مصر میں خاص طور پر فرعونیت کو تباہ کرنے اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے پیدا کیا گیا۔ اس کو قتل سے بچانے کے لیے ایک تابوت میں رکھوا کر دریا میں ڈلوایا گیا اور خاص اسی فرعون کے گھر میں پہنچایا گیا جس کو وہ تباہ کرنے والا تھا۔ اس کو پیاری صورت دی گئی کہ فرعون کے گھر والوں کے دل میں گھر کرلے۔ وَاَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ اس کے منہ کو تمام عورتوں کے دودھ سے روک دیا گیا، یہاں تک کہ وہ پھر اپنی ماں کے آغوش میں پہنچ گیا اور اس کی پرورش کا انتظام خاص حق تعالیٰ کی نگرانی میں ہوا۔ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ یہ چند مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خاص طور پر نبوت ہی کے لئے پیدا کیے جاتے تھے۔

(۲) پھر دیکھئے کہ اس طرح جن لوگوں کو پیدا کیا جاتا ہے وہ عام انسانوں کی طرح

نہیں ہوتے بلکہ غیر معمولی قابلیتوں کے ساتھ وجود میں آتے ہیں، ان کی فطرت نہایت پاکیزہ ہوتی ہے، ان کے ذہن کا سانچہ ایسا ہوتا ہے کہ اس سے جو بات نکلتی ہے سیدھی نکلتی ہے، غلط اندیشی اور کج بینی کی استعداد ہی ان میں نہیں ہوتی۔ وہ جبلی طور پر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ بلا ارادہ اور بلا کسی غور وفکر کے محض حدس اور وجدان (INTUITION) سے ان صحیح نتائج پر پہونچ جاتے ہیں جن پر دوسرے انسان غور وفکر کے بعد بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے علوم کسبی نہیں ہوتے بلکہ جبلی دوہبی ہوتے ہیں۔ حق اور باطل، صحیح اور غلط کا امتیاز ان کی عین سرشت میں ودیعت کیا جاتا ہے وہ فطرۃً صحیح سوچتے ہیں، صحیح بولتے ہیں اور صحیح عمل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت یعقوبؑ کو دیکھیے۔ حضرت یوسفؑ کا خواب سنتے ہی ان کے دل میں کھٹک پیدا ہو جاتی ہے کہ اس بچّے کو اس کے بھائی جینے نہ دینگے برادران یوسف ان کو کھیل کے لیے لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت یعقوب نہ صرف ان کی بری نیت کو بھانپ جاتے ہیں بلکہ ان کو ٹھیک وہ بہانہ بھی معلوم ہو جاتا ہے جو بعد میں وہ بنانے والے تھے۔ فرماتے ہیں:۔ وَاَخَافُ اَنْ یَّاکُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُوْنَ ہ پھر جب یوسفؑ کے بھائی خون کا بھرا ہوا کرتا لا کر دکھاتے ہیں تو حضرت یعقوبؑ دیکھ کر فرماتے ہیں:۔ بَلْ سَوَّلَتْ لَکُمْ اَنْفُسُکُمْ اَمْرًا اسی طرح جب برادران یوسفؑ مصر سے واپس آکر کہتے ہیں کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اور یقین دلانے کے لیے یہاں تک عرض کرتے ہیں کہ اس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجیے جہاں سے ہم آرہے ہیں تو حضرتِ یعقوبؑ پھر وہی جواب دیتے ہیں کہ یہ تمھارے نفس کا دھوکہ ہے۔ بیٹوں کو پھر مصر بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

اِذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُوْسُفَ وَ اَخِیْہِ ہ اس کے بعد جب ان کے بیٹے حضرت یوسفؑ کی قمیص لے کر مصر سے چلتے ہیں تو ان کو دور ہی سے حضرت یوسفؑ کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی نفسی و روحانی قوتیں کس قدر غیر معمولی ہوتی ہیں۔ یہ صرف حضرت یعقوبؑ ہی کی خصوصیت نہیں تمام انبیاء کا یہی حال ہے۔ حضرت یحییٰؑ کے متعلق ارشاد ہے۔

وَاٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا ہ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً (مریم ۱۰)	ہم نے بچپن ہی میں اس کو قوتِ فیصلہ رحم دلی اور پاک طینتی اپنی طرف سے عطا کی۔

حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے گہوارے میں کہلوایا جاتا ہے کہ :۔

وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا ہ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ہ (مریم ۔ ۲)	اور اللہ نے مجھ کو برکت والا بنایا جہاں بھی میں رہوں اور اس نے مجھ کو وصیت کی کہ جب تک جیوں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دوں اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گذار بنایا اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔

نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا :۔

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم ۔ ۱)	اور تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔

یہ سب ان جبلی اور فطری کمالات کی طرف اشارات ہیں جن کو لے کر انبیاء

علیہم السلام پیدا ہوتے ہیں۔ پھر حق تعالیٰ ان کی ان ہی فطری استعدادات کو ترقی دے کر فعلیت کی طرف لے جاتا ہے یہاں تک کہ ان کو وہ چیز عطا کرتا ہے جس کو قرآن میں علم اور حکم (قوت فیصلہ) اور ہدایت اور رمبینہ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں :۔

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ	میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا
مَالَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (اعراف۔۸)	ہوں جو تم نہیں جانتے۔

حضرت ابراہیم علیہم السلام کو ملکوت سماوات وارض کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے (انعام ۹) اور جب وہ اس مشاہدہ سے علم یقین لے کر پلٹتے ہیں تو اپنے باپ سے کہتے ہیں :۔

یٰاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ	اے باپ! میرے پاس وہ علم
مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَأْتِكَ	آیا ہے جو تیرے پاس نہیں ہے لہٰذا
فَاتَّبِعْنِیْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا	میری پیروی کرو میں تجھے سیدھا راستہ
سَوِیًّا ۝ (مریم ۔۴۳)	بتاؤں گا۔

حضرت یعقوبؑ کے متعلق ارشاد ہے :۔

وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ	اور یقیناً وہ، وہ علم رکھتا تھا جو ہم نے
لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ	اس کو تعلیم کیا تھا مگر اکثر لوگ یہ راز
النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف۔۸)	نہیں جانتے۔

حضرت یوسفؑ کے حق میں فرمایا :۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ	اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس

اٰتَيْنَاهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (یوسف ۳) کو دانش اور قوتِ فیصلہ عطا کی۔

یہی بات حضرت موسیٰؑ کے حق میں بھی فرمائی (قصص) یہی حکم اور علم حضرت لوطؑ کو عطا کیا گیا (انبیاء ۵) اور اسی غیر معمولی علم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سرفراز ہوئے۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (النساء ۱۷)	اور اللہ نے تیرے اوپر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم دیا جو پہلے تو نہ جانتا تھا۔
قُلْ اِنِّیْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ (انعام ۷)	کہو کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح اور روشن راستے پر ہوں۔
قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (یوسف ۱۲)	کہو کہ یہ میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں بھی بصیرت پر ہوں اور وہ بھی جو میرے پیرو ہیں۔

اس علم اور حکم سے نبی اور عام انسانوں کے درمیان اتنا عظیم تفاوت واقع ہو جاتا ہے جتنا ایک آنکھوں والے اور نابینا کے درمیان ہوتا ہے :-

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَیَّ ط قُلْ هَلْ يَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ط (انعام ۵)	میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ کہو اے محمد! کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں۔

ان آیات میں جس چیز کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض کتاب نہیں ہے بلکہ وہ ایک روشنی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے نفس میں پیدا کر دی جاتی ہے اسی لیے اس کا

ذکر کتاب سے الگ کیا گیا ہے اور لسے انبیاء کی صفت کے طور پر بیان کیا گیا ہے وہ اس روشنی سے حقائق کا عینی مشاہدہ کرتے ہیں، اسی سے غلط اور صحیح میں امتیاز کرتے ہیں، اسی سے معاملات میں فیصلہ کرتے ہیں اور اسی سے ان امور میں نظر کرتے ہیں جو ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ علماءِ اسلام نے اسی چیز کا نام وحیِ خفی رکھا ہے۔ یعنی وہ اندرونی ہدایت و بصیرت جو ہر وقت ان بزرگوں کو حاصل رہتی ہے۔ اور جس سے وہ ہر موقع پر کام لیتے تھے۔ دوسرے لوگ غور و فکر کے بعد بھی جن باتوں کی تہہ کو نہیں پہونچ سکتے اور جن امور میں حق اور صواب معلوم نہیں کر سکتے ان میں نبی کی نظر اللہ کی دی ہوئی روشنی اور بصیرت کے زور سے آنِ واحد میں تہہ تک پہنچ جاتی تھی۔

(۳) اس کے بعد قرآن مجید ہم کو بتاتا ہے کہ اللہ نے انبیاء علیہم السلام کو نہ صرف حکمت اور قوت فیصلہ اور غیر معمولی دانش و بینش عطا کی ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ ان پر خاص نظر رکھتا ہے، غلطیوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے، گمراہیوں سے ان کو بچاتا ہے خواہ وہ انسانی اثرات کے تحت ہوں یا شیطانی وساوس کے تحت یا خود ان کے اپنے نفس سے پیدا ہوں۔ حتیٰ کہ اگر بمقتضائے بشریت کبھی وہ اپنے اجتہاد میں بھی غلطی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے قصے میں دیکھئے۔ جب قریب تھا کہ عزیز مصر کی بیوی ان کو اپنے جال میں پھنسا لے، اللہ تعالیٰ نے اپنی "برہان" دکھا کر ان کو بدکاری سے محفوظ کر دیا۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ	اس نے یوسفؑ سے ارادۂ بد کر ڈالا اور
هَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ ی	وہ بھی اس کی طرف ارادہ کرتا۔ اگر اپنے

بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ○ (یوسف ـ ۳)

رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔ ایسا ہوا تاکہ ہم اس کو برائی اور بے حیائی سے پھیر دیں کیوں کہ وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جنکو ہم نے اپنے لیے مخصوص کرلیا ہے۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو جب فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا گیا تو انھیں خوف ہوا کہ کہیں فرعون ان پر زیادتی نہ کرے اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ کچھ خوف نہ کرو، میں تمھارے ساتھ ہوں اور سب کچھ سن اور دیکھ رہا ہوں (طٰہٰ۔ ۲) ساحروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو دیکھ کر موسیٰ ڈرے تو فوراً اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی: لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (طٰہٰ ۔ ۳) خوف بشریت کی بنا پر تھا۔ اللہ نے اس بشری کمزوری کو اپنی وحی سے دور کیا۔

حضرت نوحؑ، بیٹے کو ڈوبتے دیکھ کر چیخ اٹھے :۔ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ۔ "خدایا یہ میرا بیٹا ہے"۔ یہ بشری کمزوری تھی۔ اللہ نے اسی وقت یہ حقیقت ان پر واضح کر دی کہ وہ تیرے نطفہ سے ہو تو ہوا کرے مگر تیرے "اہل" سے نہیں ہے کیونکہ عمل غیر صالح ہے۔ بشریت نے محبت پدری کے جوش میں ذرا سی دیر کے لیے نبی کی نظر سے اس حقیقت کو چھپا دیا تھا کہ حق کے معاملہ میں باپ، بیٹا، بھائی، کوئی چیز نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے اسی وقت آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا اور حضرت نوحؑ مطمئن ہو گئے۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی متعدد مرتبہ ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔ اپنی فطری رحمت و رأفت، کفار کو مسلمان بنانے کی حرص، کفار کی تالیفِ قلب، لوگوں

کے چھوٹے سے چھوٹے احسان کا بدلہ دینے کی کوشش، منافقین کے دلوں میں ایمان کی روح پھونکنے کی خواہش اور کبھی کبھی اقتضائے بشریت کی بنا پر جب کبھی آپ سے کوئی اجتہادی لغزش ہوئی ہے وحی جلی سے اس کی اصلاح کی گئی :۔ عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی (عبس) مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰی (انفال۔۹) عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (توبہ۔۷) اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ۔۱۰) وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (توبہ۔۱۱) یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (تحریم۔۱)

یہ سب آیات اسی امر کی شہادت دیتی ہیں۔ لوگ ان آیات کو اس امر کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غلطیاں سرزد ہوتی تھیں اور آپ غلطیوں سے مبرا نہ تھے خصوصاً حضرات اہل قرآن کو تو ان آیات کے ذریعہ سے اللہ کے رسول کی غلطیاں پکڑنے میں خاص مزہ آتا ہے۔ لیکن دراصل یہی تو وہ آیتیں ہیں جن سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اپنے نبی کو غلطیوں سے بچانے اور اس کی زندگی کو ٹھیٹھ معیارِ حق پر قائم رکھنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنے ذمہ لے رکھی تھی اور یہ حقیقت صرف مذکورہ بالا آیات ہی میں بیان نہیں ہوئی ہے بلکہ قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اسے اصولی حیثیت سے بھی بیان فرمایا ہے۔ مثلاً فرمایا :۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ	اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت
وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ	نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ تم کو
مِّنْهُمْ اَنْ یُّضِلُّوْكَ وَمَا	راہ راست سے ہٹا دینے کا عزم
یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا	کر ہی چکا تھا مگر وہ خود اپنے آپ کو

يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ط وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط (النساء-۱۷)

بہکانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے اور تمھارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے کیوں کہ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تم کو وہ علم دیا ہے جو تم پہلے نہ جانتے تھے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ٥ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ٥ (بنی اسرائیل ۸)

قریب تھا کہ وہ تم کو اس بات سے جو ہم نے تم پر وحی کی ہے منحرف کر دیتے تاکہ تم اس کے سوا کچھ اور ہم پر بنالو اور اس وقت وہ تم کو دوست بنا لیتے اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے تو کسی قدر تم ان کی طرف جھک ہی جاتے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ط (الحج-۷)

ہم نے تم سے پہلے جو نبی یا رسول بھیجا ہے۔ اس نے جب کبھی کسی بات کی تمنا کی۔ شیطان نے اس کی تمنا میں وسوسہ ڈال دیا۔ مگر اللہ کا قاعدہ یہ ہے کہ (نبی کے دل میں) شیطان جو وسوسہ بھی ڈالتا ہے اللہ اسے مٹا دیتا ہے اور پھر اپنی آیات کو مضبوط کر دیتا ہے۔

ان اصولی ارشادات سے اور اوپر کی واقعاتی مثالوں سے صاف معلوم

ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زندگی کو ٹھیک معیارِ مطلوب پر قائم رکھنے کی ذمہ داری خود اپنے اوپر لی ہے اور اس نے اس بات کا سخت اہتمام کیا ہے کہ نبی سے جو لغزش بھی سرزد ہو جائے اس کی فوراً اصلاح کر لے خواہ وہ لغزش کسی ذاتی معاملہ میں ہو یا پبلک معاملہ میں۔ پھر اگر اصولی طور پر یہ بات مان لی جائے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ نبی کے جن کاموں پر اللہ تعالیٰ نے گرفت نہیں کی ہے وہ سب کے سب اللہ کے معیارِ مطلوب پر پورے اترتے ہیں۔ اور گویا ان پر خود اللہ ہی کی مہر توثیق ثبت ہے۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اس امر کی توضیح کے لیے بالکل کافی ہے کہ نبوت کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ ایک انسان جو تمام حیثیات سے دوسرے انسانوں جیسا ایک انسان ہو۔ ایک عمر کو پہنچنے کے بعد یکایک خدا کی طرف سے نزولِ وحی کے لیے چن لیا جائے اور بجز اس کتاب کے جو اس پر نازل کی گئی ہو اور کسی بات میں بھی اس کی رائے، اس کے خیالات، اس کے اعمال، اس کے احکام اور اس کے فیصلے غیر نبی انسانوں سے ممتاز نہ ہوں۔ جیسا کہ نام نہاد اہلِ قرآن کا گمان ہے یا یہ کہ اس میں اور عام انسانوں میں صرف اتنا ہی فرق ہو کہ تنزیلِ کتاب کے ساتھ اس کو احکامِ کتاب کی عملی تفصیلات بھی بتا دی گئی ہوں اور اس خاص امتیازی حیثیت سے قطع نظر کر کے وہ محض عام امیروں جیسا ایک امیر اور عام قاضیوں جیسا ایک قاضی اور عام لیڈروں جیسا ایک لیڈر رہ ہو۔ جیسا کہ مولانا اسلم جیراجپوری کا خیال ہے۔ اسی طرح نبوت کی حقیقت یہ بھی نہیں ہے کہ نبی کی ذاتِ بشریہ پر نبوت عارض ہوتی ہو اور اس کے عروض کے بعد بھی نبی کی بشریت اور اس کی نبوت دونوں علیحدہ علیحدہ رہتی ہوں

حتیٰ کہ ہم اس کی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے صرف اس شعبہ کو اطاعت واتباع کے لیے منتخب کر سکیں جو نبوت سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ ہمارے دوست چودھری غلام احمد صاحب پرؔویز کا خیال ہے۔ یہ تینوں خیالات بے اصل ہیں۔ ان کے برعکس قرآن مجید سے نبوت کی حقیقت پر جو روشنی پڑتی ہے اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ نبی اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل سے گذرنے کے بعد نبوت کے لیے منتخب نہیں کیا جاتا ہے بلکہ وہ کارِ نبوت ہی کے لیے پیدا کیا جاتا ہے وہ اگرچہ بشر ہی ہوتا ہے اور تمام حدود سے محدود ہوا کرتا ہے جو حق تعالےٰ نے فطرتِ بشریہ کے لیے مقرر فرمائی ہیں لیکن ان حدود کے اندر اس کی بشریت آخری اور انتہا درجہ کی کامل واکمل بشریت ہوتی ہے۔ جس میں وہ تمام قوتیں بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہیں۔ جو زیادہ سے زیادہ ایک انسان کو حاصل ہونی ممکن ہیں۔ اس کے جسمانی، نفسانی اور عقلی وروحانی قویٰ عدل وتسویہ (BALANCE AND MODERATION) کے انتہائی مقام پر ہوتے ہیں۔ اس کے ادراکات اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ وہ بلا کسی غور وفکر کے اپنے وجدان سے اس الہامِ الٰہی کو پا لیتا ہے جس کی طرف فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی فطرت اتنی صحیح ہوتی ہے کہ وہ کسی خارجی تعلیم وتربیت کے بغیر صرف اپنے میل طبعی سے فجور کی راہ چھوڑ کر تقویٰ کی راہ اختیار کرتا ہے، اس کا قلب اتنا سلیم ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں جو اس کے سامنے آئے اس الٰہی ہدایت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا ہے جس کی طرف "وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ" میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس کے قلب کی سلامتی اور اس کی فطرت کی صحت اس کو خود بخود ان راستوں سے ہٹا دیتی ہے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہیں۔ وہ آپ سے آپ ان راستوں پر چلتا ہے جو مرضاتِ الٰہی کے عین مطابق ہیں، یہی کامل واکمل بشریت

ہے جس کے ساتھ وہ صحیح معنوں میں بالفعل خدا کا خلیفہ ہوتا ہے۔ اور یہی چیز ہے جو اپنی پختگی اور اپنے کمال کو پہونچ جانے کے بعد ہدایت عام کے منصب پر سرفراز کی جاتی ہے۔ حق تعالیٰ کی جانب سے علم کی مزید روشنی پاکر سراج منیر بنتی ہے مصالحِ عامہ بشریہ کے لیے تعلیمات اور احکام کا مہبط قرار پاتی ہے اور اصطلاح میں نبوت و رسالت سے موسوم ہوتی ہے لہٰذا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ نبوت ایک عرض ہے جو ایک خاص وقت میں نبی کے جوہر انسانیت پر عارض ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہی انسانیت کاملہ کا جوہر ہے جو نبوت کی استعداد کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے اور فعلیت کی طرف ترقی کرتے کرتے آخر کار نبوت بنا دیا جاتا ہے۔ نبوت کا منصب ایسا نہیں ہے کہ ایک انسان تھا جو وائسرائے بنا دیا گیا حتیٰ کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا انسان ہوتا تو وہ بھی اس کی طرح وائسرائے بنا دیا جاسکتا تھا۔ بلکہ دراصل نبوت ایک پیدائشی چیز ہے اور نبی کی حیثیتِ ذاتی ہی اس کی حیثیتِ نبوی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا ہے کہ بعثت سے قبل اس کی حیثیت نبوی بالقوۃ ہوتی ہے اور بعثت کے بعد بالفعل ہو جاتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے میٹھا پھل کہ وہ بالذات میٹھا پھل ہی پیدا ہوا ہے لیکن اس کی مٹھاس پختگی کی ایک خاص حد پر پہنچ کر ہی ظاہر ہوتی ہے۔

اب ان آیات کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبوّت اور ذاتِ نبوی کے حق میں متعدد مقامات پر ارشاد فرمائی ہیں۔ میں توضیح مدّعا کے لیے ان آیات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے نقل کرتا ہوں۔

(۱) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ	اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ تم کو براہ راست غیب کا علم دے بلکہ وہ اس کام کے

يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ (آل عمران — ۱۸)

لیے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔

(۲) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ (النساء ۔ ۹)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ اللہ کے اذن[1] سے۔

(۳) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء ۔ ۱۱)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

(۴) وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۗ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ (النجم ۔ ۱)

تارے کی قسم جب وہ ٹوٹتا ہے۔ تمھارا صاحب (یعنی نبی) نہ گم کردہ راہ ہے اور نہ کج راہ اور نہ وہ ہوائے نفس سے بولتا ہے وہ صرف وحی ہے جو اس پر کی جاتی ہے۔

(۵) اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (انعام ۔ ۵)

میں صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے۔

(۶) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ۔ ۳)

تمہارے لیے رسولِ خدا میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

(۷) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ

اے محمد! کہہ دو کہ اگر تم کو خدا سے

---

[1] یعنی رسول بذاتِ خود مطاع نہیں ہوتا بلکہ خدا کے اذن یا اس کے حکم کی بنا پر مطاع ہوتا ہے۔

فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ

(آل عمران - ۴)

محبت ہے تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

(۸) اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْآ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَہُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (النور - ۷)

اہل ایمان کا کام تو یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

(۹) وَاِنْ تُطِیْعُوْہُ تَھْتَدُوْا ۝ (النور - ۷)

اور اگر تم اس کی (یعنی رسول کی) اطاعت کروگے تو ہدایت پاؤ گے۔

(۱۰) فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

(النساء - ۹)

پس قسم ہے تیرے پروردگار کی، نہیں، وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ وہ اپنے آپس کے جھگڑے میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنائیں، پھر تو جو کچھ فیصلہ کرے اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔

(۱۱) وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ

کسی مومن مرد یا عورت کو حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کردے تو اس کے لیے اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے جس

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا (احزاب۔۵)

نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

ان آیات پر غور کیجئے تو تمام حقیقت آپ پر کھل جائے گی۔

(۱) پہلی آیت میں نبی اور عام انسانوں کے درمیان فرق ظاہر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ اپنے غیب[1] کا علم ہر انسان پر فرداً فرداً ظاہر نہیں کرتا بلکہ اپنے بندوں میں سے کسی خاص بندے پر ظاہر کرتا ہے اس لیے عام انسانوں پر لازم ہے کہ وہ اس بندے پر ایمان لائیں۔

(۲) دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول پر ایمان لانے کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ اس کو رسول خدا مان لیا جائے بلکہ اس کے ساتھ رسول کی اطاعت بھی

---

[1] غیب، یعنی وہ غیر محسوس حقیقتیں جن سے واقف ہوئے بغیر دنیا میں انسانی زندگی کے لیے کوئی صحیح طریقہ اور نظام نہیں بن سکتا۔ مثلاً یہ کہ انسان کی اصلیت کیا ہے؟ وہ آزاد ہے یا کسی کا محکوم؟ محکوم ہے تو کس کا محکوم ہے؟ اپنے حاکم سے اسکے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اسے کبھی اپنے حاکم کو جواب دینا ہے یا نہیں؟ جواب دینا ہے تو کہاں؟ کس شکل میں؟ کس معیار پر؟ کن معاملات میں؟ اور اس جوابدہی میں کامیاب یا ناکام ہونے کا کیا نتیجہ ہوگا؟ ان سوالات کا جب تک کوئی جواب، اور وہ بھی قیاسی و گمانی جواب نہیں بلکہ علمی اور یقینی جواب معلوم نہ ہو، انسانی زندگی کے لیے کوئی اسکیم نہیں بن سکتی۔ اور یہی وہ علم ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں غیب کے علم سے تعبیر فرما رہا ہے۔

ضروری ہے ۔ یہ اطاعت کا حکم نہ صرف اس آیت میں بلکہ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی دیا گیا ہے مطلق ہے، مقید نہیں ہے ۔ کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ رسول کی اطاعت، فلاں فلاں امور میں ہے اور ان امور کے سوا کسی دوسرے امر میں نہیں ہے ۔ پس قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کا رسول ایک حاکم عام (GOVERNOR GENEREL) ہے جو حکم بھی وہ دے، مومنوں پر اس کا ماننا لازم ہے ۔ یہ خود رسول کے اپنے اختیار میں ہے کہ الٰہی حکومت کے تحت اپنی حکومت کے اقتدار کو مخصوص حدود کے اندر محدود کر دے ۔ اور ان حدود سے باہر لوگوں کو رائے اور عمل کی آزادی بخش دے، لیکن مومنوں کو یہ حق ہرگز نہیں دیا گیا کہ وہ خود رسول کے اختیارات کی حدبندی کریں ۔ وہ تو مطلقاً محکوم و مامور ہیں ۔ اگر رسول ان کو زراعت اور نجّاری اور حدّادی وغیرہ کے طریقوں میں سے بھی کسی خاص طریقے کو اختیار کرنے کا حکم دیتا تو ان کا فرض یہی تھا کہ بے چون وچرا اس کے حکم کی اطاعت کرتے ۔

(۳) جب اطاعت کا غیر مشروط اور غیر محدود حکم دیدیا گیا تو یہ اطمینان دلانا بھی ضروری تھا کہ نبی کی اطاعت اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت نہیں ہے جیسا کہ جاہل کفار کا خیال تھا جو کہتے تھے کہ :-

ھَلْ ھٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ ہ	کیا یہ تمہیں جیسا ایک بشر نہیں ہے ؟
اور مَاھٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُرِیْدُ اَنْ یَّتَفَضَّلَ عَلَیْکُمْ ہ	یہ کچھ نہیں ہے مگر تمہارے ہی جیسا ایک بشر، اور اس پر چاہتا یہ ہے کہ تم پر فضیلت حاصل کرے ۔

اور وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ۔ اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو تم ضرور ٹوٹے میں رہو گے۔"

بلکہ دراصل یہ خدا کی اطاعت ہے، کیوں کہ نبی جو کچھ کہتا ہے خدا کی طرف سے کہتا ہے اور جو کچھ عمل کرتا ہے خدا کی ہدایت کے ماتحت کرتا ہے وہ خود اپنے نفس کی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتا بلکہ خدا کی وحی کا اتباع کرتا ہے اس لیے تم کو مطمئن ہو جانا چاہئے کہ اس کی پیروی میں کسی قسم کی گمراہی اور غلط روی کا خطرہ نہیں ہے۔

یہی بات ہے جو تیسری، چوتھی اور پانچویں آیت میں بیان کی گئی ہے۔ چوتھی اور پانچویں آیت میں جس چیز کو وحی کہا گیا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد کتاب اللہ ہے اور کتاب کے سوا کوئی وحی نبی پر نازل نہیں ہوتی۔ لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر صرف کتاب ہی نازل نہیں کی جاتی تھی بلکہ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ ہمیشہ وحی نازل کرتا رہتا تھا اور اسی وحی کی روشنی میں وہ سیدھی راہ چلتے تھے، معاملات میں صائب رائے قائم کرتے تھے اور صحیح تدبیریں عمل میں لاتے تھے۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ نوح علیہ السلام طوفان کی پیش بندی کے لیے اللہ کی نگرانی میں اور اس کی وحی کے ماتحت کشتی بناتے ہیں (وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا) حضرت ابراہیمؑ کو ملکوت سمٰوات و ارض کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے اور مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت دکھائی جاتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کو خوابوں کی تعبیر بتائی جاتی ہے (ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ)۔ حضرت موسیٰؑ سے طور پر باتیں کی جاتی ہیں، پوچھا جاتا ہے کہ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ یہ میری لاٹھی ہے

اس سے بکریاں چراتا ہوں، حکم ہوتا ہے کہ اس کو پھینک دو۔ جب لاٹھی اژدہا بن جاتی ہے اور حضرت موسیٰ ڈر کر بھاگتے ہیں تو فرمایا جاتا ہے :۔ یٰمُوسَىٰٓ أَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْأَمِنِينَ) " موسیٰ ڈرو نہیں، آگے بڑھو، تم امن میں ہو۔" پھر حکم دیا جاتا ہے ، اِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ) فرعون کی طرف جاؤ وہ سرکش ہوگیا ہے۔" وہ اپنی مدد کے لیے ہارون علیہ السّلام کو مانگتے ہیں اور یہ درخواست قبول کی جاتی ہے۔ دونوں بھائی فرعون کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے لَا تَخَافَآ إِنَّنِي مَعَكُمَآ أَسْمَعُ وَأَرَىٰ " ڈرو نہیں، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں اور سنتا ہوں " فرعون کے دربار میں سانپوں کو دیکھ کر حضرت موسیٰ ڈرتے ہیں تو وحی آتی ہے " لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىٰ ، مت ڈرو تمھارا ہی بول بالا ہوگا۔" جب فرعون پر اتمام حجت ہو چکتا ہے تو ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ " أَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ ، میرے بندوں کو لے کر راتوں رات چل پڑو، تمھارا تعاقب کیا جائے گا۔" دریا پر پہنچتے ہیں تو فرمان آتا ہے " اِضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ، دریا پر اپنا عصا مارو۔" کیا ان میں سے کوئی وحی بھی ایسی ہے جو کتاب کی صورت میں ہدایت عامہ کے لیے نازل ہوئی ہو؟ یہ مثالیں اس امر کے ثبوت میں کافی ہیں کہ انبیاء علیہم السّلام کی طرف اللہ تعالیٰ ہمیشہ متوجہ رہتا ہے اور ہر ایسے موقع پر جہاں بشری فکر و رائے کے غلطی کرنے کا امکان ہو اپنی وحی سے ان کی رہنمائی کرتا رہتا ہے اور یہ وحی اس وحی سے ماسویٰ ہوتی ہے جو ہدایت عامہ کے لیے ان کے واسطہ سے بھیجی جاتی اور کتاب میں ثبت کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے لیے ایک الٰہی ہدایت نامے اور دستور العمل کا کام دے۔

ایسی ہی وحی غیر متلو اور وحی خفی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل ہوتی تھی جس

کی طرف قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارے کیئے گئے ہیں۔ حضورؐ انور نے پہلے بیت المقدس کو قبلہ بنایا تھا، اس کے متعلق کوئی حکم کتاب اللہ میں نہیں آیا۔ مگر جب اس قبلہ کو منسوخ کر کے بیت الحرام کو قبلہ بنانے کا حکم دیا گیا۔ اس وقت اشاد ہوا۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ	جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے صرف
الَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ	اس لیے مقرر کیا تھا کہ رسول کا
مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ	اتباع کرنے والے اور اتباع سے منہ
یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ؕ (البقرہ - ۱۷)	موڑنے والوں کے درمیان امتیاز ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے جو بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا وہ وحی کی بنا پر تھا۔

جنگ احد کے موقع پر حضورؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمھاری مدد کے لیے فرشتے بھیجے گا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے اس ارشاد کا ذکر قرآن میں اس طرح فرمایا:۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا	اللہ نے اس وعدے کو تمھارے لیے
بُشْرٰی لَکُمْ (آل عمران - ۱۳)	خوشخبری بنایا۔

ظاہر ہوا کہ یہ وعدہ اللہ کی طرف سے تھا۔

جنگ احد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر ثانیہ کے لیے لوگوں کو نکلنے کا حکم دیا۔ یہ حکم قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ مگر اللہ نے بعد میں تصدیق کی کہ یہ بھی اسی کی جانب سے تھا:۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا	جن لوگوں نے لڑائی میں زخم کھانے
لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ	کے بعد پھر اللہ اور رسول کی پکار پر

مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ (آل عمران۔۱۸) لبیک کہا۔

جنگِ بدر کے موقع پر حضورؐ کے مدینے سے نکلنے کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے:۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ (انفال۔۱) جس طرح تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے نکالا۔

گھر سے نکلنے کا حکم قرآن میں نہیں آیا۔ مگر بعد میں اللہ نے تصدیق فرمائی کہ یہ خروج اس کے حکم سے تھا نہ کہ اپنی رائے سے۔

پھر عین جنگ کے موقع پر اللہ نے اپنے نبی کو خواب دکھایا:۔

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا (انفال۔۵) جب کہ اللہ ان کو قلیل بنا کر تیرے خواب میں تجھے دکھا رہا تھا۔

منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم صدقات پر ناک بھوں چڑھائی تو اللہ نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھایا کہ یہ تقسیم خود حضرت حق کے ارشاد سے عمل میں آئی تھی:۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (توبہ۔۷) اگر وہ راضی ہو جاتے اس حصے پر جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر تمام صحابہؓ صلح کے مخالف تھے اور صلح کی شرائط ہر شخص کو ناقابلِ قبول نظر آتی تھیں مگر اللہ کے نبیؐ نے ان کو قبول کیا اور اللہ نے بعد میں تصدیق کی کہ یہ صلح اسی کی جانب سے تھی:۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (فتح۔۱) ہم نے تجھ کو فتح مبین عطا کی۔

ان آیات کے تتبّع سے اس قسم کی اور بہت سی مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ مگر یہاں استقصاء مقصود نہیں ہے، صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اللہ کا تعلق اپنے انبیاء کے ساتھ کوئی عارضی اور موقتی تعلق نہیں ہے کہ جب کبھی اس کو اپنے بندوں تک کوئی پیغام پہنچانا ہو بس اسی وقت یہ تعلق بھی قائم ہو اور اس کے بعد منقطع ہو جائے بلکہ دراصل حق تعالیٰ جس شخص کو اپنی پیغمبری کے لیے منتخب فرماتے ہیں، اس کی طرف وہ ہمیشہ ایک توجّہ خاص کے ساتھ متوجہ رہتے ہیں اور دائماً اپنی وحی سے اس کی ہدایت و رہنمائی فرماتے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی میں ٹھیک ٹھیک راہ راست پر گامزن رہے اور اس سے کوئی ایسا قول یا فعل صادر نہ ہونے پائے جو مرضاتِ الٰہی کے خلاف ہو۔ سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے وہ دراصل اسی حقیقت کا اظہار ہے اور جیسا کہ میں اس مضمون کے پہلے حصّہ میں عرض کر چکا ہوں۔ یہ بات بھی قرآن نے کھول کر بیان کر دی ہے کہ انبیاء پر ہمیشہ اللہ کی نگرانی رہتی ہے، ان کو غلط روی سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور اگر باقتضائے بشریت ان سے کبھی کوئی لغزش ہوتی ہے یا وحی خفی کے لطیف اشارے کو سمجھنے میں وہ کبھی غلطی کرتے یا اپنے اجتہاد سے کوئی ایسی روش اختیار کر جاتے ہیں جو مرضاتِ الٰہی سے سر مو بھی ہٹی ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کرتا ہے اور تنبیہ کر کے سیدھے راستے پر لے آتا ہے۔ قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کرام کی لغزشوں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی تنبیہوں کا جو ذکر آیا ہے اس کا ہرگز یہ منشاء نہیں کہ لوگوں سے انبیاء علیہم السلام کا اعتماد اٹھ جائے۔ اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ جب انبیاء بھی ہماری طرح نعوذ باللہ غلط کار ہیں تو ان کے احکام کی اطاعت اور ان کی روش کی پیروی کامل اطمینان کے ساتھ کیسے کی جا سکتی ہے۔ بلکہ اس

ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو ہوائے نفس کا اتباع کرنے یا اپنی رائے اور بشری اجتہاد پر چلنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے۔ وہ چوں کہ اس کی طرف سے اس کے بندوں کی رہنمائی کے لیے مامور کیے گئے ہیں۔ اس لیے ان پر یہ پابندی عاید کر دی گئی ہے کہ دائماً اس کی ہدایت پر کاربند رہیں اور اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی اس کی رضا کے خلاف عمل نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بعض ایسی باتوں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کی گئی ہے جو عام انسانی زندگی میں قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مثلاً کسی انسان کا شہد کھانا یا نہ کھانا اور کسی اندھے کی طرف توجہ نہ کرنا اور اس کے دخل در معقولات پر چیں بجبیں ہو جانا یا کسی کے لیے دعائے مغفرت کرنا، کون سا ایسا اہم واقعہ تھا؟ مگر اللہ نے اپنے نبی کو ایسے چھوٹے معاملات میں بھی اپنی رائے یا دوسروں کی مرضی پر چلنے نہ دیا۔ اسی طرح جنگ کی شرکت سے کسی کو معاف کر دینا اور بعض قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا ایک امیر کی زندگی میں محض ایک معمولی واقعہ ہے مگر نبی کی زندگی میں یہی واقعہ اتنا اہم بن جاتا ہے کہ اس پر وحیِ جلی کے ذریعہ سے تنبیہ کی جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ کے نبی کی حیثیت عام امراء کی سی نہیں ہے کہ وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنے میں آزاد ہو۔ بلکہ نبوت پر مامور ہونے کی وجہ سے نبی کے لیے لازم ہے کہ اس کا اجتہاد بھی منشاء الٰہی کے مطابق ہو۔ اگر وہ اپنے اجتہاد میں وحیِ خفی کے اشارے کو نہ سمجھ کر مرضی الٰہی کے خلاف بال برابر بھی جنبش کرتا ہے تو اللہ وحیِ جلی سے اس کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

(۴) اللہ نے اپنے نبی کی اس خصوصیت کو ہمارے سامنے اسی لیے بیان فرمایا ہے کہ ہم کو اس کے نبی کی راست روی پر کامل اعتماد ہو اور ہم پورے وثوق کے ساتھ یقین

رکھیں کہ نبی کا قول اور عمل گمراہی اور کج راہی اور اتباعِ ہواء اور بشری فکر ورلئے کی غلطیوں سے قطعاً محفوظ ہے ۔ زندگی میں اس کا قدم مضبوطی کے ساتھ اس صراط مستقیم پر جما ہوا ہے جو ٹھیک ٹھیک خدا کی بنائی ہوئی ہے ۔ اس کی سیرت پاک اسلامی سیرت کا ایک ایسا معیاری نمونہ ہے جس میں کسی نقص کا شائبہ تک نہیں ہے ۔ اور اللہ نے خاص طور پر اس کامل و اکمل نمونہ کو اسی لیے بنایا ہے کہ اس کے بندوں میں سے جو کوئی اس کا مقبول و محبوب بندہ بننا چاہے وہ بے خطر اسی نمونہ کی پیروی کرے ۔ اس مقصد کو چھٹی اور ساتویں آیت میں کھول دیا گیا ہے ۔ چھٹی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ تمھارے لیے رسول ؐ اللہ میں ایک " اسوۂ حسنہ " ہے اور ساتویں آیت میں رسول ؐ اللہ کے اتباع کو محبوب الٰہی بننے کا واحد ذریعہ بتایا گیا ہے ۔

یہاں پھر ہم کو کسی قسم کی تخصیص و تحدید نظر نہیں آئی صریح تعمیم و اطلاق ہے ۔ رسول ؐ اللہ کی ذات کو مطلقاً اسوۂ حسنہ بتایا گیا ہے اور مطلقاً ہی آپ کے اتباع کی ہدایت کی گئی ہے ۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس قدر زیادہ آپ ؐ کا اتباع کرو گے اور اپنی زندگی میں سیرت پاک کا رنگ جتنا زیادہ پیدا کرو گے اتنا ہی تقرب تم کو بارگاہِ الٰہی میں حاصل ہو گا ۔ اور حق تعالیٰ اتنا ہی تم کو پیار کرے گا ۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ قرار دینے اور آپ ؐ کے اتباع کا حکم دینے سے یہ مراد نہیں ہے کہ تمام معاملاتِ زندگی میں آپ نے جو کچھ کیا ہے اور جس طرح کیا ہے سب ۔ انسان بعینہٖ وہی فعل اسی طرح کریں اور اپنی زندگی میں آپ کی حیات طیبہ کی ایسی نقل اتاریں کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہے ۔ یہ مقصد نہ قرآن کا ہے ، نہ ہو سکتا ہے ۔ دراصل یہ ایک عام اور اجمالی حکم ہے جس پر عمل کرنے کی صحیح

صورت ہم کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقہ سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ مجملاً میں عرض کرتا ہوں کہ جو امور فرائض وواجبات اور تقالید شرعیہ کی نوعیت رکھتے ہیں۔ ان میں تو حضورؐ کے ارشادات کی اطاعت اور آپ کے عمل کی پیروی طابق النّعل بالنّعل کرنی ضروری ہے۔ مثلاً نماز، روزہ حج، زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ کے مسائل کہ ان میں جو کچھ آپ نے حکم دیا ہے اور جس طرح خود عمل کرکے بتایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امور جو اسلامی زندگی کی عام ہدایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً تمدنی، معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کے جزئیات، تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ بعض ایسی ہیں جن میں آپ نے اخلاق، حکمت اور شائستگی کی تعلیم دی ہے اور بعض ایسی ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ روحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضورؐ کا اتباع کرنا چاہے اور اسی غرض سے آپ کی سنت کا مطالعہ کرے تو اس کے لیے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپ کا اتباع طابق النعل بالنعل ہونا چاہئے۔ کن امور میں آپ کے ارشادات واعمال سے اصول اخذ کرکے قوانین مرتب کرنے چاہئیں۔ کن امور میں آپ کی سنّت سے اخلاق وحکمت اور خیر وصلاح کے عام اصول مستنبط کرنے چاہئیں۔ مگر جن لوگوں کی طبیعت نزاع پسند واقع ہوئی ہے۔ وہ اس میں طرح طرح کی حجتیں نکالتے ہیں۔ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی بولتے تھے تو کیا ہم بھی عربی بولیں؟ آپ نے عرب عورتوں سے شادیاں کیں تو کیا ہم بھی عربوں ہی میں شادیاں کریں؟ آپ ایک خاص وضع کا لباس پہنتے تھے تو کیا ہم بھی

ویسا ہی لباس پہنیں ؟ آپ ایک خاص قسم کی غذا کھاتے تھے تو کیا ہم بھی وہی غذا کھائیں؟
آپ کی معاشرت کا ایک خاص طریقہ تھا تو کیا ہم بھی بعینہٖ ویسی ہی معاشرت اختیار کریں؟ کاش
یہ لوگ غور کرتے کہ اصل چیز وہ زبان نہیں ہے جو آپ بولتے تھے بلکہ وہ اخلاقی حدود ہیں
جن کی پابندی کو حضور نے ہمیشہ اپنے کلام میں ملحوظ رکھا، اصل چیز یہ نہیں ہے کہ شادی
عرب عورت سے کی جائے یا غیر عرب سے بلکہ یہ ہے کہ جس عورت سے بھی کی جائے اس
کے ساتھ ہمارا معاملہ کیسا ہو، اس کے حقوق ہم کس طرح ادا کریں اور اپنے جائز شرعی اختیارات
کو اس پر کس طرح استعمال کریں۔ اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو برتاؤ اپنی
ازواج مطہرات کے ساتھ رہا اس سے بہتر نمونہ ایک مسلمان کی خانگی زندگی کے لیے
اور کون سا ہو سکتا ہے ؟ پھر یہ کس نے کہا کہ آپ جس وضع کا لباس پہنتے تھے وہی مشروع
لباس ہے ؟ اور جو کھانا آپ کھاتے تھے بعینہٖ وہی کھانا ہر مسلمان کو کھانا چاہیے ؟ اصل میں
اتباع کے قابل جو چیز ہے وہ تو تقویٰ اور پاکیزگی کے وہ حدود ہیں جو آپ اپنے کھانے
پینے اور پہننے اوڑھنے میں ملحوظ رکھتے تھے۔ انہی حدود سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ
رہبانیت اور نفس پرستی کے درمیان جس معتدل روش کا ہم کو قرآن میں ایک مجمل سبق
دیا گیا ہے اس پر ہم کس طرح عمل کریں کہ نہ تو طیبات سے ناروا اجتناب ہو اور نہ اسراف
یہی حال حضورؐ کی پرائیویٹ اور پبلک زندگی کے دوسرے تمام معاملات کا بھی ہے۔ وہ
پاک زندگی پوری کی پوری ایک سچے اور خدا ترس مسلمان کی زندگی کا معیاری نمونہ تھی۔
حضرت عائشہؓ نے سچ فرمایا کہ "کان خلقہ القرآن" اگر تم کو معلوم کرنا ہو کہ قرآن
کی تعلیم اور اسپرٹ کے مطابق ایک مومن انسان کو دنیا میں کس طرح زندگی بسر کرنا
چاہیے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو دیکھ لو۔ جو اسلام خدا کی کتاب میں مجمل ہے وہی

رسولِ خدا کی ذات میں تم کو مفصّل نظر آئے گا۔

الحمدللہ کہ ہمارے دوست چودھری غلام احمد صاحب ان لوگوں کے ہم خیال نہیں ہیں مگر بعض احادیث سے ان کو یہ شبہ ہوگیا ہے کہ "حضور ہر آن اور ہر حال میں رسول نہیں ہوتے تھے اور آپ کا ہر قول اور ہر فعل بحیثیت رسول ہی نہیں ہوتا تھا"۔ یہ غلط فہمی جن روایات سے پیدا ہوتی ہے وہ دراصل ایک دوسری حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول ہی تھے اور یہ شانِ رسالت ہی تھی کہ آپ ہمیشہ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے تھے جس کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا۔ آپ کی بعثت کا مقصد یہ تو نہ تھا کہ لوگوں سے رائے اور عمل کی آزادی قطعاً سلب کرلیں اور ان کی عقل و فکر کو معطل کردیں، نہ آپ دنیا کو زراعت اور صنعت و حرفت سکھانے آئے تھے۔ نہ آپ کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ لوگوں کے کاروبار اور ان کے ذاتی معاملات میں ان کی رہنمائی فرمائیں۔ آپ کی زندگی کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ اسلام کو عقیدہ کی حیثیت سے دلوں میں بٹھانا اور عمل کی حیثیت سے افراد کی سیرت اور سوسائٹی کے نظام میں نافذ کردینا تھا۔ اس مقصد کے سوا دوسری کسی چیز کی طرف حضورؐ نے کبھی توجہ نہیں فرمائی اور اگر شاذ و نادر کسی موقع پر کچھ فرمایا بھی تو صاف کہہ دیا کہ تم اپنی رائے اور عمل میں آزاد ہو جس طرح چاہو کرو۔ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ اگرچہ صحابۂ کرام آپ کے ہر ارشاد کو رسول کا ارشاد سمجھ کر بدل و جان اس کی اطاعت پر آمادہ تھے اور آپ کو مطلقاً مطاع و متبوع سمجھتے تھے اور اسی لیے جب کبھی حضورؐ کسی دنیوی مسئلہ میں بھی کچھ ارشاد فرماتے تو صحابہؓ کو شبہ گذرتا تھا کہ شاید یہ حکم رسالت ہو۔ لیکن کبھی ایسا نہ ہوا کہ آپؐ نے کسی ایسے مسئلہ میں، جو آپ کے مقصدِ بعثت سے متعلق نہ تھا صحابہؓ

کوئی حکم دیا ہو اور انھیں اطاعت پر مجبور کیا ہو۔ ۲۳ سال کی مدت میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مشن سے غافل نہ ہونا اور ہر آن اس باریک فرق کو ملحوظ رکھنا کہ کونسا معاملہ اس مشن سے تعلق رکھتا ہے، اور کون سا نہیں رکھتا اور اپنے متبعین پر کامل اقتدار رکھنے کے باوجود کبھی ان کو کسی غیر متعلق امر میں حکم نہ دینا خود اس بات کا شاہد ہے کہ شانِ رسالت کسی وقت بھی حضورؐ سے منفک نہ ہوتی تھی۔ مگر یہ خیال کرنا صحیح نہ ہو گا کہ دنیوی معاملات میں جو کچھ حضورؐ نے فرمایا وہ حداکی وحی سے نہ تھا۔ اگرچہ آپ کے ایسے ارشادات آپ کے احکام نہیں ہیں نہ آپ نے ان کو حکم کے انداز میں فرمایا اور نہ کسی نے ان کو حکم سمجھا۔ مگر پھر بھی جو بات آپ کی زبان مبارک سے نکلی وہ سراسر حق تھی اور غلطی کا اس میں شائبہ تک نہ تھا۔ مثال کے طور پر طبِّ نبوی کے باب میں جو کچھ آپؐ سے ثابت ہے وہ ایسی ایسی حکیمانہ باتوں سے لبریز ہے جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عرب کا امّی جو طبیب نہ تھا، جس نے کبھی بھی طب کی تحقیق نہ کی تھی وہ کس طرح اس فن کی ایسی حقیقتوں تک پہنچا جو صدیوں کے تجربات کے بعد اب منکشف ہو رہی ہیں۔ اس قسم کی سیکڑوں مثالیں ہم کو حضورؐ کے حکیمانہ ارشادات میں ملتی ہیں۔ اگرچہ یہ باتیں بقول آپ کے تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں مگر اللہ اپنے رسولوں کی جبلّت میں جو غیر معمولی قوتیں ودیعت فرماتا ہے وہ صرف تبلیغ رسالت ہی کے کام نہیں آتیں، بلکہ ہر معاملہ میں اپنی شان امتیاز دکھا کر رہتی ہیں۔ حدّادی اور زرہ سازی کا تبلیغ رسالت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ مگر حضرت داؤدؑ اس میں غیر معمولی کمال رکھتے تھے اور حق تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ یہ فن ہم نے اس کو سکھایا تھا۔ وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُم مِّن بَأْسِكُمْ (انبیاء - ۸۰)۔ پرندوں کی بولیاں جاننے سے تبلیغ رسالت کو کیا واسطہ؟ حضرت سلیمانؑ اس میں کمال ظاہر فرماتے ہیں اور خود کہتے

ہیں:۔ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (النمل - ۲) نجاری اور کشتی سازی تبلیغ رسالت کا کون سا شعبہ ہے؟ مگر اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ سے یہ نہیں کہتا کہ ایک مضبوط سی کشتی بنا لو۔ بلکہ فرماتا ہے وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (ہود - ۴)

پس انبیاء کے حق میں یہ گمان کرنا صحیح نہیں کہ ان پر صرف وہی امور وحی کیے گئے تھے جو براہ راست تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت ان کی ساری زندگی حق تعالیٰ کی ہدایت کے تابع تھی۔ البتہ اگر فرق ہے تو یہ کہ ان کی زندگی کا ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کے قدم بقدم چلنا مسلمان کے لیے ناگزیر شرط ہے اور ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کا اتباع ہر مسلمان پر فرض نہیں۔ مگر جو شخص اللہ کا محبوب و مقبول بندہ بننا چاہتا ہو اور بارگاہ حق میں تقرب کا طلبگار ہو اس کے لیے بغیر اس کے چارہ نہیں کہ ٹھیک ٹھیک نبی کی سنت پر چلے۔ حتیٰ کہ اگر یک سر مو بھی اس خط سے ہٹے گا تو تقرب اور محبوبیت میں اسی انحراف کی حد تک کسر رہ جائے گی اس لیے کہ محبوبیت کے لیے بجز اتباع نبی کے اور کوئی راستہ ہی نہیں۔ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ۔

(۵) اس بحث کے بعد یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کی امارت اور دوسرے امیروں کی امارت میں کیا فرق ہے اور نبی کے فیصلے اور دوسرے قاضیوں کے فیصلے میں کتنا عظیم الشان تفاوت ہے۔ تاہم میں نے تین آیتیں آخر میں ایسی نقل کی ہیں جن سے یہ فرق قطعی طور سے واضح ہو جاتا ہے۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے حکم پر سر جھکا دینا اور آپؐ کے فیصلے کو تسلیم کرنا ایمان کے لیے ضروری شرط ہے۔ جو اس سے انکار کرے وہ مومن ہی نہیں۔ کیا یہ بات کسی دوسرے امیر یا قاضی کو حاصل ہے؟ اگر نہیں تو یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ اللہ اور رسول کے الفاظ قرآن میں جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں ان سے

مراد امارت ہے۔" مجھے مولانا جیراجپوری کے اسی قول پر اعتراض ہے اور میں اس کو قرآن مجید کی تعلیم کے قطعاً خلاف سمجھتا ہوں۔ رہا وہ مسئلہ جو چودھری صاحب نے پیش فرمایا ہے تو وہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے اور اس میں مجھے ان سے بالکل اتفاق ہے میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولی الامر کی اطاعت واجب ہے اور اولی الامر اسلامی حکومت کے وہ تمام فرائض انجام دیں گے جو رسول اکرم اپنی حیات طیبہ میں انجام دیتے تھے اور معاملات میں اولی الامر کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہو گا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنی دانست میں ان کے فیصلہ کو حکم خدا اور رسول کے خلاف بھی سمجھتا ہو۔ تب بھی ایک خاص حد تک اس کے لیے لازم ہو گا کہ اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے ان کے فیصلے کو تسلیم کرے۔ لیکن اس کے یہ معنی کبھی نہیں ہو سکتے کہ" امارت بعینہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں اللہ اور رسول کہا گیا ہے اور امارت کے احکام ہو بہو وہی ہیں جو اللہ اور رسول کے احکام ہیں"۔ اگر ایسا ہو تو امراء کے بگڑ جانے اور ارباب حل و عقد کے کتاب وسنّت سے منحرف ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کے لیے کوئی چارہ ان کی اطاعت کرنے کے سوا اور ہلاکت کے راستوں میں ان کی پیروی کرنے کے سوا باقی نہ رہے گا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی بندۂ خدا اٹھے اور رسول کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کرے تو مولانا اسلم کے فتوے کی رو سے امراء اس کو باغی قرار دے کر قتل کر دینے میں بالکل حق بجانب قرار پائیں گے۔ اور ان کو یہ کہنے کا حق ہو گا کہ "اللہ اور رسول" تو ہم ہی ہیں۔ دوسرا کون ہے جس کی طرف تو ہم کو پھیرنا چاہتا ہے۔

(ترجمان القرآن، ربیع الثانی ۵۴ھ، جولائی ۳۵ء)

حدیث اور قرآن

منکرین حدیث کے مسلک پر ایک ناقدانہ نظر

حال میں ایک صاحب نے ایک مختصر سا رسالہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے "میں منکر حدیث کیوں[1] ہوا؟" مصنف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا بلکہ اپنے لیے "حق گو" کا لقب اختیار فرمایا ہے۔ ان ہی "حق گو" صاحب کا ایک مفصل مضمون "مطالعۂ حدیث" کے عنوان سے بھی بعض رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے جس کے بعض حصے ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ دلائل قریب قریب وہی ہیں جو منکرین حدیث کی جانب سے پیش کیے جاتے ہیں ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے لیے صرف قرآن کافی ہے۔ حدیث کی روایات ناقابل اعتبار ہیں اور ان پر مذہب کی بنیاد رکھنا صحیح نہیں ہے۔ حق گو صاحب اور ان کے ہم خیال منکرین حدیث کی رائے میں حدیث نے اسلام کو قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ بلکہ اس کے برعکس اسی چیز نے دشمنان اسلام کو وہ اسلحہ فراہم کیے ہیں جن سے وہ اسلام پر حملے کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی خواہش ہے

---

[1] شائع کردہ "دفتر امتِ مسلمہ" امرت سر

کہ اسلام سے حدیث کو بالکل خارج کر دیا جائے اور اس کو وہ اسلام کی بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔

حق گو صاحب نے اپنی تائید میں حدیث کی کتابوں سے بہت سی شہادتیں پیش کی ہیں جن سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ احادیث سے کس طرح دشمنوں کو اسلام اور رسول کی رسالت پر حملہ کرنے کے لیے مواد حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً بعض احادیث تحریف قرآن کا ثبوت فراہم کرتی ہیں، بعض اس الزام کی تائید کرتی ہیں کہ وحی کا نزول ایک ڈھونگ تھا۔ رسول اللہؐ جو کچھ اہل کتاب سے سنتے تھے اسی کو وحی بنا کر پیش کر دیتے تھے (معاذ اللہ)، بعض سے معلوم ہوتا تھا کہ وحی کا نزول رسول اللہؐ کی خواہشاتِ نفسانی کے مطابق ہوتا تھا۔ بعض اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ رسول اللہ پر جادو کا اثر ہوتا تھا، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ اپنے مخالفین کو خفیہ طریقوں سے قتل کرا دیتے تھے (کعب ابن اشرف کا واقعہ) بعض سے رسول اللہؐ پر ظلم اور بے رحمی کا الزام عائد ہوتا ہے (عکل اور عرینہ والوں کا قتل)، بعض سے رسول پر نفس پرستی کا الزام نکلتا ہے۔ اسی سلسلہ میں مصنف نے رسول اکرمؐ پر شاردا ایکٹ بھی نافذ کیا ہے اور ان سب روایات کو ناقابل اعتبار ٹھیرایا ہے۔ جو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نو سال کی عمر میں شادی ہونا ثابت کرتی ہیں۔ اس کے بعد مصنف علم حدیث پر عام اعتراضات کرتا ہے۔ اس کے خیال میں حدیث کی اشاعت عہد خلفائے راشدین میں ممنوع تھی۔ بنوامیہ اور آل عباس کے زمانے میں روایت کا سلسلہ شروع ہوا اور بادشاہوں کی سیاسی اغراض کے لیے حدیثیں وضع کی گئیں۔ امام حسن بصری، امام زہری، امام مالک، صحاح ستہ کے مصنفین اور دوسرے وہ لوگ جنھوں نے حدیث کی کتابیں مدون کی ہیں، سب کے سب مصنف کے زعم میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے تھے اور ان لوگوں نے بے سر دپا روایات جمع کر کے اسلام کو مسخ کر دیا۔ سیاسی اغراض کے علاوہ حدیث میں یہودیت، مسیحیت، مجوسیت اور ۔۔۔

مذاہب کے عقائد اور خرافات بھی داخل ہو گئے۔ پانچ وقت کی نماز، تیس دن کے روزے صراط اور میزان کا تخیّل۔ احکامِ ذبیحہ، کھانے پینے کی چیزوں میں مذہب کا دخل، ختنہ، قربانی احکامِ طہارت، تصاویر اور مجسموں کی حرمت، معراج کے قصّے اور ایسی ہی بہت سی چیزیں مصنّف کے نزدیک محدّثین نے دوسرے دوسرے مذاہب سے لیں اور رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر کے اسلام میں داخل کر دیں۔

ائمۂ فقہ بھی مصنّف کے نزدیک قابل طعن ہیں۔ کیونکہ انھوں نے شریعت کا تخیّل یہودیوں سے لے کر اسلام کے سر چپیک دیا۔ زندگی کے تمام معاملات پر مذہب کو حاوی کر دیا۔ جو قوانین عراق کی آب و ہوا اور پہلی دوسری صدی کے حالات کی بنا پر وضع کیے گئے تھے ان کو رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے مذہبی قوانین بنا ڈالا اور اس طرح مذہب اسلام "قومی شریعت" کا پابند ہو کر اس قابل نہ رہا کہ دنیا میں اس کی اشاعت ہوتی اور دوسری قومیں اس کا اتباع کر سکتیں مصنف کے نزدیک سینٹ پال اور اس کے متبعین کا یہ خیال درست تھا کہ مذہب (یعنی ایمانیات) کو شریعت (یعنی قانونِ حیات) سے الگ کر دیا جائے اور یہی چیز دنیا میں مسیحیت کی اشاعت کا باعث ہوئی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی مصنف کے خیال میں اس لیے ہوئی تھی کہ شریعت کی بیڑیوں کو کاٹ دیں اور زندگی کے معاملات کو مذہب کی پابندیوں سے آزاد کر دیں۔ دلیل میں یہ آیت پیش کی گئی ہے کہ:۔ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ اس آیت میں اغلال (بیڑیوں) سے مراد مصنّف کے نزدیک "اغلال شریعت" ہیں اور وہ کہتا ہے کہ ائمۂ فقہ اور حدیث نے رسول اللہؐ کے خلاف بغاوت کر کے پھر انہی اغلال شریعت کو مسلمانوں پر ڈال دیا جنھیں کاٹنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کیے گئے تھے اور یہود کی

کی تقلید میں ان لوگوں نے روایت حدیث اور "شریعت سازی" شروع کر دی۔ یہ سب کچھ مصنف کی رائے میں اس لیے کیا گیا کہ یہود کے فریسیوں کی طرح یہ لوگ مسلمانوں پر اپنی گرفت قائم کرنا چاہتے تھے اور اس غرض کے لیے انھوں نے رسولؐ کے نام کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔

پھر لطف یہ ہے کہ مصنف اپنے ان تمام نظریات کی بنا تاریخی استدلال پر رکھتا ہے حالانکہ اگر حدیث کی روایات قابل اعتبار نہیں ہیں تو تاریخ ان سے بھی زیادہ ناقابل اعتبار ہے۔ حدیث میں تو ہمارے زمانہ سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام یا ائمہ تک اسناد کا پورا سلسلہ موجود ہے خواہ وہ آپ کے نزدیک مشکوک ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن تاریخ کے پاس تو کوئی سند ہی نہیں ہے۔ جن قدیم کتابوں کو آپ تاریخ کا سب سے زیادہ معتبر ذخیرہ سمجھتے ہیں۔ ان کے متعلق آپ کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ جن مصنفین کی طرف وہ منسوب ہیں انھیں کی لکھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح جو حالات ان کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں ان کے لیے بھی آپ کوئی ایسی سند نہیں رکھتے جس کی بنا پر ان کی صحت کا یقین کیا جا سکے۔ پس اگر حدیث کی مسلسل اور مستند روایات کی تکذیب اس آسانی کے ساتھ کی جا سکتی ہے تو تاریخ کے پورے ذخیرے کو اس سے بھی زیادہ آسانی کے ساتھ رد کر دیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص بے تکلف کہہ سکتا ہے کہ عباسیوں کا وجود دنیا میں کہیں نہ تھا، اموی سلطنت کبھی قائم نہیں ہوئی، سکندر کا وجود محض ایک افسانہ ہے غرض تاریخ کے ہر واقعہ کو اس دلیل سے بدرجہا زیادہ قوی دلیل کی بنا پر جھٹلایا جا سکتا ہے جس کی بنا پر آپ حدیث کو جھٹلاتے ہیں کیوں کہ دنیا میں زمانۂ گذشتہ کے حالات کا کوئی ذخیرہ اتنا مستند نہیں ہے جتنا حدیث کا ذخیرہ ہے اور جب وہ بھی ناقابل اعتبار ہے تو قدیم زمانہ کے

متعلق جتنی روایات ہم تک پہونچی ہیں وہ سب دریا برد کر دینے کے قابل ہیں۔ تعجب ہے کہ جو شخص حدیث کی روایات سے انکار کرتا ہو اور جس کے نزدیک یہ ممکن ہو کہ رسول اللہ سے قریب تر زمانہ میں ایسے ایسے نامور مسلمان بھی، جن سے زیادہ نمایاں ہستیاں مسلمانوں کی قوم سے پیش نہیں کی جا سکتیں اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود رسول اللہ پر بہتان گھڑ سکتے تھے۔ اور اپنے دل سے حدیثیں وضع کر کے رسول اللہ کی طرف منسوب کر سکتے تھے۔ وہ آخر تاریخ پر کیسے اعتماد کر لیتا ہے؟ وہ کیوں نہیں کہتا کہ طبری، ابن اثیر و ابن خلدون اور تاریخ کی تمام کتابیں موضوع ہیں، افسانہ ہیں اور گذشتہ زمانہ کا کوئی حال ہم تک صحت کے ساتھ نہیں پہونچا ہے؟ اس سے زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ جو شخص بخاری و مسلم، ترمذی و ابوداؤد حتیٰ کہ امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام حسن بصری تک کو ناقابل اعتماد سمجھتا ہے وہ قرآن کریم سے استناد کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بات کی پیچ آدمی کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔

"حق گو" صاحب کا رسالہ اگر ناواقف مسلمان یا غیر مسلم پڑھے تو اس کے دل پر یہ بات نقش ہو جائے گی کہ رسول اللہ کی وفات پر پچاس برس بھی نہ گذرے تھے کہ مسلمانوں نے رسول خدا اور اسلام کے خلاف عام بغاوت کر دی اور وہی لوگ اس بغاوت کے سرغنے بنے جو اسلام کی مذہبی تاریخ میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں اور جنھیں مذہب اسلام کا ستون سمجھا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے دل میں ایمان کا شائبہ تک نہ تھا، انھوں نے اپنی اغراض کے لیے حدیث، فقہ، سنت اور شریعت کے شاندار الفاظ گھڑے اور دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے وہ باتیں رسول اللہ کی طرف منسوب کیں جو آنحضرت اور قرآن کی تعلیم کے بالکل خلاف تھیں۔ یہ اثر پڑنے کے بعد ہمیں امید نہیں کہ کوئی شخص اسلام کی صداقت کا قائل

ہو گا۔کیونکہ جس مذہب کے ائمہ اور ممتاز ترین داعیوں کا یہ حال ہو اس کے پیروؤں میں صرف "حق گو" صاحب اور ان کے ہم خیال گنتی کے چند آدمیوں کو دیکھ کر کون عقلمند یہ باور کرے گا کہ ایسا مذہب بھی کوئی سچا مذہب ہو سکتا ہے یہی نہیں بلکہ اس قسم کے اعتراضات کو دیکھ کر تو ایک شخص اس امر میں بھی شک کر سکتا ہے کہ آیا اسلام اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے بھی یا نہیں۔کیوں کہ جب مسلمانوں کے اسلاف میں پہلی صدی سے لے کر اب تک کوئی گروہ بھی ایسا موجود نہیں رہا جو اپنے پیغمبر کے حالات۔اقوال اور تعلیمات کو ٹھیک ٹھیک محفوظ رکھتا اور جب اس قوم کے چھوٹے بڑے سب کے سب ایسے بد دیانت تھے کہ جو کچھ جی میں آتا تھا گھڑ کر اپنے رسول کی طرف منسوب کر لیتے تھے تو اسلام کی کسی بات کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔بلکہ یہ بھی یقین نہیں کیا جا سکتا کہ عرب میں فی الواقع کوئی پیغمبر مبعوث ہوا تھا۔کیا عجب کہ عوام پر گرفت قائم کرنے کے لیے رسول اور رسالت کا افسانہ گھڑ لیا گیا ہو۔اسی طرح قرآن کے متعلق بھی شک کیا جا سکتا ہے کہ وہ فی الواقع کسی پیغمبر پر اترا تھا یا نہیں، اور اگر اترا بھی تھا تو اپنی اصلی عبارت میں محفوظ ہے یا نہیں۔کیونکہ اس کے ہم تک پہونچنے کا ذریعہ وہی لوگ تو ہیں جو یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کی باتیں لے کر پیغمبر کی طرف منسوب کرتے ہوئے ذرا نہ شرماتے تھے۔یا پھر وہ لوگ ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہوتا تھا اور وہ دم نہ مارتے تھے۔"حق گو" صاحب اور ان کے ہم خیال منکرین حدیث نے یہ ایسا حربہ دشمنانِ اسلام کے ہاتھ میں دیدیا ہے جو حدیث کے فراہم کیے ہوئے حربوں سے لاکھ درجہ زیادہ خطرناک ہے۔اس سے تو اسلام کی جڑ بنیاد ہی کھود کر پھینکی جا سکتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ "حق گو" صاحب نے حدیث کی کتابوں پر صرف عیب چینی کی نگاہ ڈالی ہے اور کتابوں کے بیشمار جواہر کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنا سارا وقت

ان چیزوں کی تلاش میں صرف کیا ہے جو ان کے نزدیک حدیث پر طعن کرنے کے لیے مفید ہوسکتی تھیں۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسی عیب چینی کی نگاہ سے وہ قرآن کو دیکھتے تو یہ کتاب بھی ان کو عیوب سے لبریز نظر آتی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہزارہا کفار قرآن کو پڑھتے ہیں اور بجائے ہدایت پانے کے اور زیادہ گمراہ ہوجاتے ہیں؟ یہی نا کہ وہ ہدایت کی طلب میں قرآن نہیں پڑھتے بلکہ عیوب تلاش کرنے اور اسلام کے خلاف اسلحہ فراہم کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ اسی وجہ سے تو ان کو قرآن میں بجز عیوب کے اور کچھ نہیں ملتا کیوں کہ انسان ہر جگہ وہی کچھ پاتا ہے جس کی اسے طلب ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ قرآن کا مطالعہ کرتے وقت "حق گو" صاحب کی آنکھوں پر عیب چینی کی عینک نہ لگ گئی۔ ورنہ وہ دیکھتے کہ مخالفین اسلام کو بہت سے اسلحہ اس کتاب نے بھی فراہم کیے ہیں۔ اور یہ بات ان کو قرآن سے بھی انکار کر دینے پر اسی طرح آمادہ کر دیتی جس طرح حدیث کے فراہم کردہ اسلحہ دشمنوں کے ہاتھ میں دیکھ کر انھوں نے حدیث سے انکار کر دیا۔

"حق گو" صاحب نے حدیث پر جتنے اعتراضات کیے ہیں ان سب کا لفظ بلفظ جواب دیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم جزئیات میں الجھنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ چند اصولی باتوں پر کلام کرنا چاہتے ہیں جو دراصل مدار بحث ہیں۔ اگرچہ ان کی اور عام منکرین حدیث کی عیب جویانہ ذہنیت کو دیکھتے ہوئے اصلاح کی امید کم ہے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ ان لوگوں کی گمراہی کا آغاز دراصل نیک نیتی کے نقطہ سے ہوتا ہے۔ اور محض ناواقفیت اور ضد ان کو غلط راستوں پر ڈال دیتی ہے۔ اس لیے ہم امید رکھتے ہیں کہ اگر انھوں نے اپنے ذہن کو منکرانہ خیالات سے تھوڑی دیر کے لیے خالی رکھ کر ہمارے دلائل پر غور کیا تو ان کے عقیدہ کی اصلاح ہوجائے گی۔

سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس سے پہلے تمام آسمانی کتابوں کو رسولوں کے واسطے سے کیوں نازل کیا؟ کیا اللہ اس پر قادر نہ تھا کہ مطبوعہ کتابیں یکایک زمین پر اتار دیتا اور ان کا ایک ایک نسخہ نوعِ بشری کے ہر فرد کے پاس آپ سے آپ پہنچ جاتا؟ اور اگر وہ اس پر قادر نہ تھا تو عاجز تھا اس کو خدا ہی کیوں مانیے؟ اور اگر وہ قادر تھا، اور یقیناً قادر تھا تو اس نے نشر و اشاعت کا یہ ذریعہ کیوں نہ اختیار کیا؟ یہ تو بظاہر ہدایت کا یقینی ذریعہ ہو سکتا تھا کیوں کہ ایسے صریح معجزے اور بین خرق عادت کو دیکھ کر ہر شخص مان لیتا کہ یہ ہدایت خدا کی طرف سے آئی ہے۔ لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا اور ہمیشہ رسولوں ہی کے ذریعے سے کتابیں بھیجتا رہا۔ پھر اس رسالت کے کام پر بھی اس نے فرشتوں یا دوسری غیر انسانی ہستیوں کو مامور نہ کیا بلکہ ہمیشہ انسانوں ہی کو اس کے لیے منتخب فرمایا۔ ہر زمانہ کے کفار نے ہیترا کہا کہ اگر خدا کو ہم تک کوئی پیغام پہنچانا ہی منظور رہے تو فرشتے کیوں نہیں بھیجتا تاکہ ہم کو بھی اس پیغام کے منزل من اللہ ہونے کا یقین آجائے مگر خدا نے ہر ایسے سوال پر یہی فرمایا کہ اگر ہم فرشتے بھی بھیجتے تو ان کو آدمی بنا کر بھیجتے وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (انعام - ۱) اور یہ کہ اگر زمین میں فرشتے بستے ہوتے تو ہم ان کی ہدایت کے لیے فرشتے بھیجتے۔ لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل - ۱۱)

سوال یہ ہے کہ تنزیل کتب کے لیے رسولوں کو واسطہ بنانے اور رسالت کے لیے تمام بندگان خدا میں سے بالخصوص انسانوں ہی کو منتخب کرنے پر اس قدر اصرار کیوں کیا گیا؟ اس کا جواب خود کلام اللہ دیتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ خدا نے جتنے رسول بھیجے ہیں ان کی بعثت کا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ فرامین خداوندی کے مطابق حکم دیں اور لوگ ان کے

احکام کی اطاعت کریں۔ وہ الٰہی قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور لوگ انہی کے نمونہ کو دیکھ کر اس کا اتباع کریں۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (النساء-۹) انبیاء علیہم السلام پے درپے آئے اور ہر ایک نے لوگوں سے یہی مطالبہ کیا کہ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِيْعُوْنِ ج (الشعراء: ۶-۷-۸-۹-۱۰) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا گیا کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰہُ (آل عمران-۴) مومنوں سے کہا گیا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب-۳) اگر محض کتاب اللہ اتار دی جاتی اور کوئی رسول نہ آتا تو لوگ آیات کے معنیٰ میں اختلاف کرتے اور کوئی اس کا فیصلہ کرنے والا نہ ہوتا۔ لوگ احکام کے منشا سمجھنے میں غلطیاں کرتے اور کوئی ان کو صحیح منشاء بتانے والا نہ ہوتا۔ اس ضرورت کو تو خیر ایک حد تک فرشتے بھی پورا کر سکتے تھے۔ مگر پاکیزگی، طہارت اور تقوی کے احکام پر لوگ یہ خیال کرتے کہ عملی زندگی میں ان پر عمل کرنا انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ فرشتہ تو انسانی جذبات سے محروم ہے، پیٹ نہیں رکھتا، شہوانی قوتیں نہیں رکھتا، انسانی ضرورتوں سے بے نیاز ہے، اس کے لیے متقیانہ زندگی بسر کرنا کچھ مشکل نہیں مگر انسانی کمزوریاں رکھتے ہوئے اس کی تقلید کیسے کریں؟ اس لیے ضروری تھا کہ ایک انسان انہی جذبات و داعیات اور انہی تمام قوتوں اور انسانی اختیارات کے ساتھ زمین پر آتا اور لوگوں کے سامنے احکام الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرکے بتاتا کہ اس طرح انسان خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کر سکتا ہے۔ اس کو زندگی کے وہ تمام معاملات پیش آتے جو انسان کو پیش آتے ہیں، وہ ان تمام معاملات میں عام انسانوں کے ساتھ شریک ہوتا، عملاً حصہ لیتا، قدم قدم پر ان کو اپنے عمل اور اپنے قول سے ہدایات دیتا، ان کی تربیت کرتا اور ان کو بتاتا کہ زندگی کی پیچیدہ راہوں میں سے کس طرح

انسان بچ کر حق اور نیکی کے سیدھے راستے پر چل سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے تنہا کتاب اللہ کو کافی نہ سمجھا اور رسول اللہ ؐ کے اتباع اور ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کو اس کے ساتھ لازم کر دیا۔

قرآن شریف میں صاف طور پر تین چیزوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ایک حکم خدا، دوسرے حکم رسول، تیسرے مسلمان حکام اور فرماں رواؤں کے احکام اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (النساء۔ ۸) محض قرآن کا اتباع کافی ہوتا اور اس کے سوا کسی دوسری چیز کے اتباع کی حاجت نہ ہوتی تو رسول اور حکام (اولی الامر) کی اطاعت کا حکم ہی نہ دیا جاتا۔اگر رسول اور اولی الامر کا حکم قرآنی احکام کے ماسوا کوئی شے نہ ہوتا۔تب بھی بقیہ دونوں کی اطاعت کا حکم الگ دینا بے معنیٰ تھا۔تین چیزوں کی اطاعت کا الگ الگ حکم دینا صاف بتاتا ہے کہ قرآن میں جو احکام براہ راست اللہ تعالےٰ نے دیئے ہیں ان کے علاوہ احکام بھی واجب الاطاعت ہیں جو رسول اللہ دیں ان کی اطاعت بعینہٖ ایسی ہے جیسی اللہ کی اطاعت۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (النساء۔ ۱۱) پھر ان کے ماسوا جو احکام مسلمانوں کے اولی الامر دیں ان کی اطاعت بھی لازم ہے بشرطیکہ ان کے احکام خدا اور رسول کے احکام سے اصولی مطابقت رکھتے ہوں۔اختلاف کی صورت میں ضروری ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کی دی ہوئی ہدایت کی طرف رجوع کیا جائے۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (النساء۔ ۸)

اس سے معلوم ہوا کہ تنہا کتاب اللہ کافی نہیں ہے اس کے ساتھ رسالت کا رشتہ ناقابل انقطاع ہے اور احکام رسول کی اطاعت اور اسوۂ رسول کی پیروی بھی اسی طرح

فرض ہے جس طرح خود کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت فرض ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ ہم صرف کتاب اللہ کو لیں گے اور حکم رسولؐ و اسوۂ رسول کو نہ لیں گے وہ رسالت سے اپنا تعلق منقطع کرتا ہے، وہ اس واسطہ کو کاٹتا ہے جسے خود اللہ نے اپنے بندوں اور اپنی کتاب کے درمیان ایک لازمی واسطہ کے طور پر قائم فرمایا ہے۔ وہ گویا یہ کہتا ہے کہ خدا کی کتاب اس کے بندوں کے لیے کافی تھی مگر خدا نے بلا ضرورت یہ فعل عبث کیا کہ کتاب کو رسول کے ذریعہ سے نازل فرمایا:۔ سُبۡحَانَہٗ وَ تَعَالیٰ عَمَّا یَقُوۡلُوۡنَ۔

کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کا لازمی تعلق ثابت ہو جانے کے بعد اب اس سوال پر غور کیجیے کہ آیا رسولؐ اللہ کے احکام کی اطاعت اور ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی صرف ان کے حیات جسمانی تک ضروری تھی؟ ان کے بعد اس کی حاجت باقی نہیں رہی؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت صرف اسی عہد کے لیے تھی جس میں آپ جسم کے ساتھ زندہ تھے۔ آپؐ کے رحلت فرماتے ہی آپ کی رسالت کا تعلق عملاً دنیا سے منقطع ہو گیا۔ اس صورت میں رسالت کا منصب بے معنی ہو جاتا ہے رسول کا کام اگر محض ایک نامہ بر کی طرح کتاب اللہ کو پہنچا دینا تھا اور اس سے بڑھ کر کسی اور چیز کی ضرورت نہ تھی تو ہم پھر وہی کہیں گے کہ اس صورت میں رسول کی ضرورت ہی نہ تھی یہ کام کوئی فرشتہ کر سکتا تھا بلکہ اسے بلا واسطہ بھی کرنا ممکن تھا لیکن اگر کتاب پہونچا دینے کے علاوہ بھی کسی شے کی ضرورت تھی اور اسی کے لیے اتباع کے احکام دیئے گئے تھے اور اگر ہدایت نوعِ بشری کے لیے قرآن کے ساتھ رسول کی ہدایات اور سیرتِ نبوی کے عملی نمونے کی بھی ضرورت تھی تو پھر یہ سب کچھ صرف ۲۳ تیئیس ۲۴ چوبیس سال کے لیے ہونا کیا معنی؟ محض ایک صدی کے چوتھائی حصّہ کے لیے ایک رسول مبعوث کرنا اور اتنی سی مدّت کے لیے رسالت

کا اتنا بڑا مقصد قائم کرنا اور ایک چیز کو جو رسول کے جسم و جان کا تعلق منقطع ہوتے ہی دنیا کے لیے غیر ضروری ہو جانے والی تھی۔ اتنی شد و مد کے ساتھ ذریعہ ہدایت قرار دینا، یہ سب بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے جو خدائے حکیم و دانا کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہے۔

اس الزام کو خود اللہ نے اپنی کتاب میں دفع کر دیا ہے۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء۔ ۱۱) ظاہر ہے کہ اگر رسول کا فیضانِ رسالت صرف اپنے زمانے تک کے لیے ہوتا تو آپ کو رحمۃ للعلمین نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگر کہا جائے کہ آپ قرآن لائے ہیں جو ہمیشہ رہنے والا ہے اور اسی لیے آپ رحمۃ للعالمین ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ رحمت نہ تھے بلکہ رحمت تو قرآن تھا اور آپ کو خواہ مخواہ رحمت کہہ دیا گیا حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو الگ رحمت فرمایا ہے اور اس کے لانے والے کو الگ۔ پھر یہ جو فرمایا کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (سبا۔ ۳) یہ ارشاد صاف اشارہ کر رہا ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت سے لے کر قیامت تک جن بندگانِ خدا پر "الناس" کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان سب کے لیے آپ خدا کے رسول ہیں۔ آپ کی رسالت کسی خاص زمانہ کے لیے نہیں ہے بلکہ جب تک روئے زمین پر "الناس" بستے ہیں اس وقت تک آپ کی رسالت قائم ہے۔ آیت میں کوئی قرینہ ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ "الناس" سے صرف اسی زمانہ کے لوگ مراد ہیں، نہ ایسا کوئی خفیف سے خفیف اشارہ موجود ہے جس سے بعد کے کسی خاص زمانہ تک کی قید نکلتی ہو۔ بخلاف اس کے دوسری آیات اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں کہ حضورؐ کی رسالت دائمی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضورؐ کے ذریعہ سے دین کی تکمیل کر چکا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدہ۔ ۱)

حضورؐ کی ذات پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (الاحزاب۔ ۵) اور دوسرے انبیاء کی لائی ہوئی کتابوں کے بخلاف آپ کی لائی ہوئی کتاب کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کیا گیا ہے کیونکہ پہلی کتابیں مخصوص زمانوں کے لیے ہدایت تھیں اور یہ دائمی ہدایت ہے۔ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر۔ ۱)

اس سے ثابت ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت ہمیشہ کے لیے ہے اور جب ایسا ہے تو وہ تمام آیات اور احکام بھی ہمیشہ کے لیے ہیں جن میں آنحضرتؐ کے احکام کی اطاعت فرض قرار دی گئی ہے۔ آپ کی ذات کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ آپؐ کے اتباع کو رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ کہا گیا ہے۔ اور ہدایت کا دامن آپ کی پیروی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا (النور۔ ۷) رضائے الٰہی حاصل کرنے اور ہدایت پانے کی ضرورت جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عہد لوگوں کو تھی اسی طرح آج کے لوگوں کو بھی ہے اور قیامت تک جو لوگ آئیں گے ان سب کو رہے گی۔ پس جب یہ دونوں چیزیں رسولؐ اللہ کے اتباع اور آپؐ کے نمونۂ حیات کی تقلید کے ساتھ وابستہ ہیں تو لازم ہوا کہ سیرتِ نبوی کے وہ پاک نمونے اور زبان وحی ترجمان کے وہ مقدس احکام بھی قرآن کے ساتھ ساتھ باقی رہیں جن سے رسولِ اکرمؐ کے ہم عہد لوگوں نے ہدایت پائی تھی۔ ورنہ بعد کی نسلوں کے لیے ہدایت ناقص رہ جائے گی۔

میں نے "ہدایت ناقص رہ جائے گی" کے الفاظ بہت ہی نرم استعمال کیے ہیں۔ تنزیلِ کتب کے ساتھ رسالت کا جو ناقابل انقطاع رشتہ اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے اور اس باب میں اللہ تعالیٰ کی جو غیر متبدل سنت ابتدا سے چلی آ رہی

ہے۔ اس کا لحاظ کرتے ہوئے تو مجھے کہنا چاہیے تھا کہ اگر اسوۂ رسول باقی نہ رہتا، اگر رسول کے احکام باقی نہ رہتے تو ہدایت کا وہ پاک سرچشمہ بند ہو جاتا جو رسول اللہؐ کی سیرت میں تھا تو محض کتاب اللہ سے دنیا کی ہدایت ہو ہی نہیں سکتی تھی اس لیے کہ رسالت کے آثار مٹ جانے کے بعد کتاب اللہ کا باقی رہ جانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے رسول کے بغیر تنہا کتاب اللہ کا نازل ہونا۔ اگر کتاب کی تنزیل کے بعد آثار رسالت کے باقی رہنے کی ضرورت نہیں ہے تو سرے سے تنزیل کے لیے رسالت ہی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خدا کی حکمت پر کھلا ہوا طعن ہے اور اگر تنزیل کے ساتھ رسالت کا ہونا لازم ہے تو یقیناً اس کے ساتھ آثار رسالت رہنا بھی لازم ہے۔ بغیر آثار رسالت کے تنہا کتاب اللہ موجب ہدایت نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آثار رسالت محو ہو جاتے تو مسلمانوں کا حشر ان قوموں کا سا ہو جاتا جن کے پاس بجز افسانوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ لوگ کہتے کہ جس شخص پر تمھارے قول کے مطابق یہ کتاب نازل ہوئی ہے اس کے حالات تو بتاؤ کہ ہم ان کو جانچ کر دیکھیں کہ آیا فی الواقع وہ رسول خدا ہونے کے قابل تھا بھی یا نہیں۔ مگر ہم انھیں کچھ نہ بتا سکتے۔ لوگ پوچھتے کہ تمھارے پاس قرآن کے دعوے کی تائید میں کون سی ایسی خارجی شہادت ہے جس سے تمھارے نبی کی نبوت ثابت ہو سکتی ہو؟ مگر ہم کوئی شہادت نہ پیش کر سکتے۔ ہم کو خود یہ معلوم نہ ہو سکتا کہ کب اور کن حالات میں قرآن نازل ہوا، کس طرح رسول اللہ کی شخصیت اور آپ کی پاک زندگی کو دیکھ کر لوگ فوج در فوج ایمان لائے، کس طرح آپؐ نے نفوس کا تزکیہ کیا، حکمت کی تعلیم دی اور آیات الٰہی کی تلاوت سے معرفت حق کا نور پھیلایا، کس طرح آپؐ نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں تنظیم اور اصلاح کا وہ زبردست کام انجام دیا اور شریعت کا وہ ہمہ گیر اور حکیمانہ ضابطہ بنایا

جو محض انسانی عقل کے بس کا کام نہیں ہے اور جو اس بات کا ناقابل انکار ثبوت ہے کہ آپ حقیقت میں اللہ کے رسول تھے۔ یہی نہیں بلکہ اگر وہ روایات نہ ہوتیں جو منکرین حدیث کے نزدیک دریا برد کر دینے کے قابل ہیں تو ہم قرآن کی سند اس کے لانے والے تک نہ پہنچا سکتے۔ ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہ ہوتا کہ یہ قرآن حقیقت میں وہی ہے اور اسی عبارت میں ہے جس میں رسول اللہ پر نازل ہوا تھا۔ ہماری اس کتاب کی حیثیت وہی رہ جاتی جو ژند اوستا، گیتا، ویدوں اور بدھ مذہب کی کتابوں کی حیثیت ہے اسی طرح ہماری مذہبی زندگی کے جتنے اعمال اور جتنے اصول اور قوانین ہیں یہ بھی سب کے سب بے سند ہو کر رہ جاتے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے اعمال جس صورت میں ادا کیے جاتے ہیں ان کے متعلق ہم نہ بتا سکتے۔ اور خود نہ جانتے کہ یہ سب رسول اللہ کے مقرر کیے ہوئے طریقوں پر ہیں۔ منکرین حدیث کہتے ہیں کہ ان سب اعمال کے لیے "سنت متواترہ" کافی ہے مگر مدون اور مستند روایات کی غیر موجودگی میں اس "سنت متواترہ" کی حیثیت بجز اس کے اور کیا ہوتی کہ اگلوں سے پچھلوں تک نسلاً بعد نسلٍ ایسا ہوتا چلا آیا ہے؟ اس قسم کی متواتر سنتیں تو ہندوؤں۔ بودھوں اور دوسری قوموں میں بھی ہیں۔ وہ سب بھی یہی کہتے ہیں کہ جو عبادتیں ہم کرتے ہیں اور جو رسمیں ہم میں جاری ہیں وہ بزرگوں سے یونہی چلی آرہی ہیں۔ مگر کیا آج ان کی "سنت متواترہ" پر دنیا اور خود ان قوموں کے روشن خیال لوگوں میں یہ شبہ نہیں کیا جاتا کہ خدا جانے ان طریقوں کی اصل کیا تھی اور امتداد زمانہ کے ساتھ وہ کس طرح بدلتے چلے گئے؟ کیا ان تمام طریقوں پر آج رسوم پرستی (RAITUALISM) کی پھبتی نہیں اڑائی جاتی؟ اگر کوئی شخص ان میں تغیر کر کے کوئی نئی بدعت ایجاد کرنا چاہے تو کیا ان کے پاس اس بدعت کے خلاف کوئی حجت بجز اس ایک

دلیل کے موجود ہے کہ جو کچھ باپ دادا کرتے چلے آرہے ہیں اس میں تغیّر نہیں ہو سکتا؟ پھر اگر منکرین حدیث کی خواہش کے مطابق ہمارے یہاں بھی ایسی مسلسل، مستند اور مرتب روایات نہ ہوتیں جو ہمارے عہد سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک ہر واقعہ یا ہر قول کی سند بہم پہنچا دیتی ہیں۔ اور اگر ہمارے پاس بھی صرف عمل متواتر ہی باقی رہ جاتا جس کو "حق گو" "صاحب" "سنت متواترہ" سے تعبیر فرماتے ہیں تو ہمارے مذہبی اعمال اور معتقدات کا حال ان طریقوں اور ان اوہام سے کچھ مختلف نہ ہوتا جو ہندوؤں اور دوسری قوموں میں پائے جاتے ہیں اور جن کو "رسوم" اور "مذہبی افسانوں" سے تعبیر کیا جاتا ہے[1] غور کیجئے، یہ اسلام کے لیے قوت اور استحکام کا سبب ہوتا یا کمزوری و نا استواری کا سبب؟

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ سنّت رسول کا رہنا قطعاً ضروری اور ناگزیر ہے۔

اب اس سوال کی طرف آیئے کہ سنّتِ رسول کے ہم تک پہنچنے کی صورت کیا ہے اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ بالکل ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد سے رحلت تک تقریباً ربع صدی تک جو زمانہ بسر کیا وہ محض قرآن پڑھنے اور سنانے ہی میں بسر نہیں ہوا ہوگا بلکہ آپؐ تلاوت آیات کے علاوہ بھی شب و روز اپنے دین کی تبلیغ فرماتے رہتے ہوں گے۔ گمراہ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش بھی فرماتے ہوں گے۔ ایمان لانے والوں

---

[1] خود مسلمانوں میں عرسوں، نیازوں اور شادی و غمی کی رسموں کا جو سلسلہ آج چل رہا ہے۔ حدیث کی غیر موجودگی میں ان سب کو بھی "سنتِ متواترہ" قرار دیا جا سکتا ہے اور انکار حدیث کے بعد ان "متواتر سنتوں" کی تردید نہیں کی جا سکتی۔

کو تعلیم بھی دیتے ہوں گے اور اپنی عبادات، اپنے اخلاق اور اپنے اعمالِ حسنہ کا نمونہ پیش کر کے لوگوں کی تربیت اور اصلاح کرنے میں مشغول رہتے ہوں گے۔ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے:۔ یَتْلُوا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ:۔ ۱۸) نیز قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلمانہ زندگی ایسی شدید مصروفیت میں بسر ہوتی تھی کہ آپؐ کو اپنے آرام کا ذرہ برابر خیال نہ تھا۔ ہر لمحہ یا تو عبادات میں بسر ہوتا تھا یا وعظ و نصیحت اور تعلیمِ حکمت اور تزکیۂ نفوس میں، حتیٰ کہ بار بار اللہ تعالیٰ آپ سے فرماتا تھا کہ آپ اس قدر محنت کیوں کرتے ہیں؟ اپنے آپ کو ہلاک کیوں کیے ڈالتے ہیں؟

اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسی سرگرم مبلغانہ زندگی میں آیات قرآنی کے سوا کوئی بات بھی آپ کی زبان سے ایسی نہ نکلتی تھی جو یاد رکھنے اور بیان کرنے کے قابل ہوتی؟ کوئی کام بھی آپؐ کی زندگی کا ایسا نہ تھا جس کو لوگ اپنے لیے نمونہ سمجھتے اور دوسروں کو اس پاکیزہ نمونہ کی تقلید کا مشورہ دیتے۔؟ آپ کے اقوال و اعمال کے متعلق تو اہل ایمان کا اعتقاد تھا اور قرآن نے بھی ان کو یہی اعتقاد رکھنے کا حکم دیا تھا کہ آپ کا ہر ارشاد برحق ہے۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی (النجم۔۱) اور آپ کا ہر عمل واجب التقلید ہے لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ؕ ظاہر ہے یہ اعتقاد رکھتے ہوئے تو مسلمان یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ارشاد کو دل سے سنتے ہوں گے۔ ہر عمل پر نگاہ رکھتے ہوں گے اور آپس میں ایک دوسرے کے سامنے حضورؐ کے اقوال و اعمال کے چرچے کرتے ہوں گے۔ جہاں رسالت یا کسی قسم کے تقدس کا اعتقاد نہیں ہوتا وہاں بھی بڑے لوگوں کی باتوں اور حرکات و سکنات پر لوگ نظر رکھتے

ہیں اور ان کے اقوال و اعمال کے چرچے کیا کرتے ہیں پھر کیوں کر ممکن تھا کہ صحابہؓ کرام جس مقدس انسان کو خدا کا رسول اور اسلام کا مکمل نمونہ سمجھتے تھے۔ اس سے صرف قرآن لے لیتے اور اس کے دوسرے تمام ارشادات اور اس کے تمام اعمال کی طرف سے کان اور آنکھیں بند کر لیتے۔

اس زمانہ میں فوٹوگرافی کے آلات نہ تھے کہ آنحضرتؐ کی تمام حرکات و سکنات کے فلم لے لیے جاتے، نہ آواز بھرنے کے آلات تھے کہ آپؐ کی تقریروں کے ریکارڈ بھر کر رکھ لیے جاتے، نہ مکہ و مدینہ سے اخبارات نکلتے تھے کہ روزانہ آپ کی تبلیغی سرگرمیوں اور آپ کے اعمال حیات کی رپورٹیں شائع ہوتیں۔ ضبط اور نقل کا ذریعہ جو کچھ بھی تھا وہ لوگوں کا حافظہ اور زبانیں تھیں قدیم زمانہ میں نہ صرف عرب بلکہ تمام قوموں کے پاس واقعات کو محفوظ رکھنے اور بعد کی نسلوں تک پہنچانے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ مگر عرب خصوصیت کے ساتھ اپنے حافظہ اور صحت نقل میں ممتاز تھے۔ اور ان کی یہ خصوصیت ایسی تھی کہ شاید ہمارے "حق گو" صاحب کے قون کریم کو بھی ان سے انکار نہ ہو۔ جو قوم ایام العرب، کلام جاہلیت انسابِ قبائل حتیٰ کہ اونٹوں اور گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد کرتی ہو اور اپنی اولاد کو یاد کراتی ہو، اس سے بعید تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم الشان شخصیت کے حالات اور آپ کے ارشادات کو یاد نہ رکھتی اور آنے والی نسلوں تک انھیں منتقل نہ کرتی؟

پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو فطری بات تھی کہ لوگوں میں آپ کے احوال و اقوال کی جستجو اور زیادہ بڑھ جاتی۔ جو لوگ حضورؐ کی زیارت اور صحبت سے محروم رہ گئے تھے، ان میں یہ شوق پیدا ہونا بالکل فطری امر تھا کہ آپؐ کے صحبت یافتہ بزرگوں سے آپؐ کے ارشادات اور آپؐ کے حالات پوچھیں۔ ہم خود دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی پیر مرد ایسا نکل آتا

ہے جس نے پچھلی صدی کے اکابر میں سے کسی بڑے نامور شخص کی صحبت پائی ہو، لوگ اس کے پاس جاتے ہیں اور اس کے حالات دریافت کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے شمالی ہندوستان سے حیدرآباد کا سفر صرف اس غرض کے لیے کیا کہ اگر یہاں کوئی پرانا آدمی ایسا مل جائے جس نے سید جمال الدین افغانی کی صحبت پائی ہو تو اس سے سید صاحب کے حالات معلوم کریں۔ یہ معاملہ جب معمولی انسانوں کے ساتھ پیش آتا ہے تو کیا یہ ممکن تھا کہ خدا کے سب سے بڑے پیغمبر اور دنیا کے سب سے بڑے معلم کی وفات کے بعد مسلمانوں میں اس کے حالات پوچھنے اور اس کے ارشادات سے مستفید ہونے کی کوئی خواہش نہ ہوتی، کیا تاریخ کے ان واقعات میں کوئی استبعاد ہے کہ لوگ جہاں کہیں کسی صحابی کی خبر پا لیتے وہاں سیکڑوں میل سے سفر کر کے جاتے اور آنحضرت صلعم کے حالات پوچھتے۔؟ یہی معاملہ یقیناً صحابہؓ کے بعد تابعین کے ساتھ پیش آیا ہوگا۔ کم از کم دو صدی تک سماعت حدیث اور نقل حدیث کا غیر معمولی تشغف مسلمانوں میں پایا جانا یقینی ہے اور یہ بات نہ صرف قیاس کے عین مطابق ہے بلکہ تاریخ بھی اس کی شہادت دیتی ہے۔ منکرین حدیث قیاس عقلی سے تو کام ہی نہیں لیتے۔ رہی تاریخ تو وہ اس کے صرف اسی حصہ کو مانتے ہیں جس سے انکار حدیث کے لیے مواد مل سکتا ہو۔ اس کے سوا تاریخ کی جتنی شہادتیں ہیں سب ان کے نزدیک نامعتبر ہیں لیکن جن لوگوں میں انکار حدیث کے لیے ضد پیدا نہیں ہوئی ہے وہ یقیناً اس بات کو تسلیم کر لیں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست شخصیت اور آپؐ کی تابناک پیغمبرانہ زندگی اتنی ناقابل اعتناء تو نہ تھی کہ مسلمانوں میں کم از کم دو سو برس تک بھی آپ کے حالات معلوم کرنے اور آپؐ کے ارشادات سننے کا عام شوق نہ رہا ہو۔ اس سے انکار کرنے کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ قرون اولیٰ کے لوگوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اثر نہ تھا اور وہ لوگ بھی آپؐ کی جانب کوئی توجہ نہ رکھتے تھے جو آپؐ کی رسالت کے

قائل ہو چکے تھے۔ منکرین حدیث کو اختیار ہے کہ رسول کی ذات اور ان لوگوں کے متعلق جو آپ سے قریب تر تھے یہ یا اس سے بھی زیادہ بری کوئی رائے قائم کریں مگر ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی مسلمان تو کجا، اسلامی تاریخ اور اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنے والا کوئی منصف مزاج غیر مسلم بھی اس رائے کو صحیح باور نہ کرے گا۔

اس میں شک نہیں کہ عہد رسالت سے دور ہونے کے بعد مسلمانوں میں بیرونی اثرات بھی داخل ہونے لگے تھے اور یہ اثرات وہ لوگ بیشتر اپنے ساتھ لائے تھے جنھوں نے عراق ایران، شام اور مصر میں مذہب اسلام تو قبول کر لیا تھا مگر قدیم مذاہب کے تخیلات ان کے ذہن سے محو نہ ہوئے تھے اس میں بھی شک نہیں کہ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو اپنے دل سے گھڑ کر باتیں نکالتا تھا اور محض لوگوں پر اثر قائم کرنے کے لیے ان باتوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیتا تھا یہ دونوں باتیں تاریخ سے بھی ثابت ہیں اور قیاس بھی یہی چاہتا ہے کہ ایسا ضرور ہوا ہو گا۔ مگر کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں سب کے سب ایسے ہی لوگ تھے؟ سب جھوٹے اور بے ایمان تھے؟ سب ایسے منافق تھے کہ اس ہستی پر بہتان گھڑتے جس کی رسالت پر وہ دن بھر میں کم از کم پانچ مرتبہ گواہی دیا کرتے تھے؟ سب ایسے دشمن حق تھے کہ دنیا بھر کی خرافات لے کر رسولؐ کے نام سے خدا کے دین میں داخل کرنے اور اس کی جڑیں کاٹتے۔؟ یہ نتیجہ نہ عقلاً نکالا جا سکتا ہے اور نہ تاریخ اس کی تائید کرتی ہے۔ اور جب یہ صحیح نہیں ہے تو صداقت کے ساتھ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر سے حدیث کے ذخیرے میں ایک حصہ ایسی روایات کا بھی داخل ہونے لگا تھا جو موضوع تھیں اور یہ کہ بعد کی نسلوں کو جو احادیث پہونچی ہیں ان میں صحیح اور غلط اور مشکوک سب قسم کی حدیثیں ملی جلی تھیں۔ کھرے اور کھوٹے کی اس آمیزش کے بعد صحیح طریق کار کیا

تھا؟ کیا یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ آمیزش کی بنا پر صحیح اور غلط سب کو ایک ساتھ رد کر دیا جاتا اور بعد کے مسلمان رسالت سے اپنا تعلق منقطع کر لیتے؟ منکرین حدیث اس کو ایک آسان بات سمجھتے ہیں۔ مگر جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے تھے اور رسول اللہ کی ذات کو اسوۂ حسنہ سمجھتے تھے اور جن کے نزدیک حضورؐ کی پیروی کے بغیر ہدایت کا میسّر ہونا ممکن نہ تھا۔ ان کے لیے ایسا کرنا بہت دشوار تھا، اتنا دشوار جتنا کسی کے لیے برضا و رغبت آگ میں کود پڑنا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے سب کو رد کر دینے کی بہ نسبت پہاڑ کھود کر جواہر نکالنے کی مشقت کو زیادہ آسان سمجھا۔ رسالت سے اپنا اور مسلمانوں کا تعلق برقرار رکھنے کے لیے شب و روز محنتیں کیں، حدیثوں کو جانچنے اور پرکھنے کے اصول بنائے۔ کھرے کو کھوٹے سے ممتاز کیا۔ ایک طرف اصول روایت کے اعتبار سے حدیثوں کی تنقیح کی۔ دوسری طرف ہزاروں لاکھوں راویوں کے اوصاف و احوال کی جانچ پڑتال کی۔ تیسری طرف درایت کے اعتبار سے حدیثوں پر نقد کیا، اور اس طرح سنّت رسول کے متعلق ان لوگوں نے ایک ایسا ذخیرہ فراہم کر دیا جس کے برابر مستند اور معتبر ذخیرہ آج دنیا میں گذشتہ زمانے کے کسی شخص اور کسی عہد کے متعلق نہیں ہے۔ منکرین حدیث کو آزادی ہے کہ ان کی ساری محنتوں پر بیک جنبش قلم پانی پھیر دیں۔ منکرین حدیث کو اختیار ہے کہ دین کے ان سچے خادموں کو "وضاعِ حدیث، پروردگانِ عجم، زلہ ربایان بنو امیہ و بنی عباس" اور جو کچھ چاہیں کہیں۔ لیکن یہ حق ہے کہ مسلمانوں پر ان محدثین کا اتنا بڑا احسان ہے کہ وہ قیامت تک اس بار سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اللہ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے۔ یہ انہی عاشقان رسول کی محنتوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس رسولؐ اکرم اور صحابۂ کرامؓ

لہ یہ سب القاب "حق گو صاحب" نے ائمہ حدیث کے لیے استعمال فرمائے ہیں۔

کے عہد کی پوری تاریخ اپنے جزئیات کے ساتھ موجود ہے اور وہ وسائل بھی ہمارے پاس موجود ہیں جن سے ہم حدیث کے ذخیرہ کی جانچ پڑتال کر کے آج بھی واقعات کی صحیح صحیح تحقیق کر سکتے ہیں۔ منکرین حدیث کہتے ہیں کہ بجز متواتر روایات کے (جو بہت کم ہیں) باقی جتنی احادیث ہیں یقینی نہیں ہیں، ان سے علم و یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے۔ پھر ایسی چیزوں پر مذہب کا مدار رکھنا کیا معنیٰ؟ ہم کہتے ہیں کہ مشاہدۂ عینی اور تجربہ کے سوا دنیا میں کوئی ذریعہ بھی ایسا نہیں ہے جو مفید یقین ہو سکتا ہو۔ تواتر کو بھی محض اس قیاس کی بنا پر یقینی سمجھا جاتا ہے کہ بہت سے آدمیوں کا جھوٹ پر متفق ہو جانا مستبعد ہے لیکن خبر متواتر کے لیے جو شرائط ہیں وہ بہت کم ایسی خبروں میں پائی جاتی ہیں جن پر تواتر کا گمان ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر امور غیب میں جو زمانۂ ماضی سے تعلق رکھتے ہوں یا حال سے، ہمارے علم اور ہمارے فیصلوں کا مدار اسی ظنِ غالب پر ہے جو کم از کم دو شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ خود قرآن نے اسی ظنی شہادت کو اتنا معتبر قرار دیا ہے کہ اس کی بنا پر ایک مسلمان کا خون مباح ہو سکتا ہے۔ حالانکہ قرآن کی رو سے مسلمان کا خون اتنا محترم ہے کہ جو کوئی مسلمان کو عمداً قتل کر دے اسے خلود فی النار کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح زنا، قذف اور سرقہ کی حدود میں بھی ایسے اہم فیصلہ جات کا مدار صرف دو یا چار شہادتوں پر رکھا گیا ہے جن سے ایک مسلمان کا ہاتھ کاٹ دیا جا سکتا ہے یا ایک مسلمان کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جا سکتے ہیں۔ پس جب قرآن مجید میں غیر متواتر شہادتوں پر ہی پورے نظامِ عدل کی بنیاد رکھی گئی ہے تو قرآن کے مقابلہ میں کس مسلمان کو یہ کہنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ کسی حدیث کو حدیثِ رسول مان لینے کے لیے ہر مرتبہ اسناد میں دو چار راویوں کا ہونا کافی نہیں ہے؟ البتہ راویوں میں سے ہم ہر راوی پر اعتماد نہ کریں گے۔ جس طرح شاہدوں میں سے ہر شاہد کا اعتبار نہیں کرتے۔ ہم حکم قرآن کے بموجب ذَوَا عَدْلٍ کی شرط لگاتے ہیں اور اسی کی تحقیق کے

لیے اسماء الرجال کا فن ایجاد کیا گیا ہے تاکہ راویوں کے حالات کی تحقیق کی جائے۔ اسی طرح ہم راویوں پر جرح بھی کریں گے کہ حدیث کے جوہری نکات میں ان کے درمیان ایسا اختلاف تو نہیں ہے جو ان کے بیان کی صحت کو مشکوک کر دیتا ہو؟ اسی طرح ہم درایت سے بھی کام لینگے جیسے ایک جج مقدمات میں درایت سے کام لیتا[1] ہے۔ مگر جس طرح شاہدوں کے بیانات کا جانچنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے اسی طرح درایت بھی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ حدیث کو اصول درایت پر وہی شخص جانچ سکتا ہے جس نے قرآن کا علم حاصل کر کے اسلام کے اصول اولیہ کو خوب سمجھ لیا ہو اور جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس ہو جاتا ہے اور اسلام کی صحیح روح اس کے دل و دماغ میں بس جاتی ہے۔ پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اول نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں؟ یا آپ کا عمل ایسا ہو سکتا تھا یا نہیں؟ پھر جس طرح ایک معاملہ میں دو قاضیوں کا اجتہاد مختلف ہوتا ہے اور جس طرح قرآن مجید کے معانی میں دو فاضلوں کی تفسیریں مختلف ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح دو محدثوں کی درایت میں بھی اختلاف ممکن ہے۔ خدا نے ہم کو انسانی طاقت سے زیادہ کسی چیز کا مکلف قرار نہیں دیا ہے۔ اختلاف

---

[1] فن حدیث میں درایت کی حیثیت وہی ہے جو قانون میں جج کی رائے اور قوت فیصلہ کی حیثیت ہے۔ جس طرح جج ہر گواہ کے بیان کو یونہی قبول نہیں کر لیتا بلکہ اس کو مختلف پہلوؤں سے جانچ کر رائے قائم کرتا ہے۔ اسی طرح ایک محدث بھی ہر روایت کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرتا بلکہ جانچ پڑتال کر کے اس کے متعلق رائے قائم کرتا ہے۔

رائے انسانی فطرت کا مقتضیٰ ہے اور اس کی وجہ سے نہ قرآن چھوڑا جاسکتا ہے، نہ حدیث، نہ عدالت کی کرسی۔ بس ایک حدیث کے متعلق جس حد تک تحقیق انسان کے بس میں ہے اس کا سامان محدثین نے فراہم کر دیا ہے۔ ہمارا کام اس سامان سے فائدہ اٹھا کر صحیح کو غلط سے ممتاز کرنا اور صحیح کا اتباع کرنا ہے، نہ یہ کہ صحیح و غلط کے اختلاط کو دیکھ کر سرے سے رسالت ہی سے قطع تعلق کر لینا۔

منکرین حدیث کہتے ہیں کہ ہم حدیث کو صرف تاریخ کی حیثیت سے لیں گے حجت شرعی نہ بنائیں گے۔ مگر کیا ان حضرات نے رسولؐ کی تاریخ کو سکندر اور نپولین کی تاریخ سمجھا ہے کہ اس کے صحیح ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو؟ کیا وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ اس انسان کی تاریخ ہے جس کا اتباع فرض ہے۔ جس کی اطاعت پر نجات کا مدار ہے جس کی سیرت مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے؟ اس ذات پاک کی تاریخ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یا صحیح ہوگی یا غلط۔ اگر غلط ہے تو اس کو لینا کیا معنی نذر آتش کر دیجئے رسولؐ پر بہتان اور آپ اس کو تاریخ کی ہی حیثیت سے قبول کریں؟ اور اگر یہ صحیح ہے تو اس کا اتباع فرض ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے اس کی پیروی سے آپ بچ کہاں سکتے ہیں۔؟

منکرین حدیث کے مقالات پر نظر کرتے ہوئے انکار حدیث کے دو وجوہ قرار دیئے جاسکتے ہیں:۔

ایک یہ کہ اسلام کے نظامِ دینی میں سرے سے حدیث کی ضرورت ہی نہیں، صرف قرآن کافی ہے۔

دوسرے یہ کہ احادیث ناقابل اعتبار ہیں۔

ان میں سے پہلی وجہ کا جواب دیا جا چکا ہے۔ رہی دوسری وجہ تو اس کی غلطی اشارۃً

گذشتہ صفحات میں ظاہر کی جا چکی ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس شبہ کو بھی تفصیل کے ساتھ رفع کر دیا جائے۔ احادیث کو ناقابل اعتبار سمجھنے کی اصل وجہ وہم اور شک کا حد سے زیادہ بڑھ جانا ہے۔ انسان کی فطرت میں شک کا مادہ اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ بحث و تحقیق اور تلاش و تجسّس کے لیے متحرک ہو اور حقیقت کی جستجو پر انسان کو ابھارے۔ لیکن ہر چیز کے لیے ایک حد ہوتی ہے جس سے گھٹنے یا بڑھ جانے پر وہ مستحسن نہیں رہتی۔ شک کا مادہ اگر اتنا بڑھ جائے کہ وہ تحقیق کے ان طریقوں سے جو انسان کے امکان میں ہیں مطمئن نہ ہونے دے اور ان تمام باتوں سے انکار پر آمادہ کر دے جو تحقیق کے ان غیر ممکن الحصول معیار پر پوری نہ اترتی ہوں تو یہ بھی ایک مذموم صفت ہے جس کو ہم اردو زبان میں "وہمی پن" سے تعبیر کرتے ہیں۔

غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ انسان اکثر و بیشتر معاملات میں صرف اس تحقیق پر اعتماد کرنے کے لیے مجبور ہے جس سے ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ اس تحقیق میں شک کرے اور علم یقین کے بغیر ہر بات کو ماننے سے انکار کر دے تو وہ دنیا کے کام کا نہ رہے گا بلکہ شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکے گا۔ مثال کے طور پر میں نے آج تک کبھی کسی شخص کو سانپ کے کاٹے سے مرتے ہوئے نہیں دیکھا، نہ مجھے سانپ نے کاٹا کہ اس کے مہلک ہونے کا علم یقین مجھے حاصل ہوتا۔ میں نے صرف لوگوں سے یہ سنا ہے کہ جب سانپ کاٹتا ہے تو انسان مر جاتا ہے۔ میں اس روایت پر یقین رکھتا ہوں اور سانپ کو دیکھ کر اس سے بچ جاتا ہوں۔ لیکن اگر میں اس روایت میں شک کروں اور کہوں کہ جب تک سانپ میرے سامنے کسی کو نہ کاٹے اور اسی کی تاثیر سے وہ میرے سامنے مر نہ جائے یا جب تک سانپ خود مجھ کو نہ کاٹے اور میں اس کے زہر سے مر نہ جاؤں اس وقت تک میں یقین نہ کروں گا کہ سانپ مہلک ہوتا ہے تو میرے اس شک کا جو کچھ انجام ہو گا وہ ظاہر ہے۔

یہ تو خیر روایت متواترہ کی مثال ہے جس کے مفید یقین ہونے کو عموماً تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ہماری زندگی کے بے شمار معاملات ایسے ہیں جن میں ہم اخبار آحاد (یعنی ایک دو راویوں کی دی ہوئی خبروں) کو تسلیم کرتے ہیں اور انھی پر اپنے فیصلوں اور اپنے علم و عمل کا مدار رکھتے ہیں۔ محض خبر ہونے کی غرض سے ہر خبر میں سچ اور جھوٹ ہونے کا یکساں احتمال ہوتا ہے۔ مگر ہم ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دینے کے لئے محض خبر کے ہونے ہی پر نظر نہیں رکھتے بلکہ عموماً خارجی قرائن سے مدد لے کر صدق یا کذب کے کسی ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہیں اور بسا اوقات ہماری یہ ترجیح اتنی زیادہ قوی ہوتی ہے کہ دوسرے پہلو کے امکان کو بھی تسلیم کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہوتے مثلاً ہر شخص کو یہ بات کہ وہ اپنے باپ کی جائز اولاد ہے صرف اپنی ماں کی روایت سے معلوم ہوتی ہے۔ اس خبر واحد میں جس کے لیے کوئی دوسرا شاہد سرے سے مل ہی نہیں سکتا، نفس خبر ہونے کی حیثیت سے صدق و کذب کا یکساں احتمال ہے لیکن کوئی شریف آدمی اس میں کذب کے پہلو کو ترجیح دینا تو درکنار، کسی درجہ میں بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ خواہ واقعہ کے اعتبار سے اس کا اپنی ماں کے بیان پر یقین کرنا درست نہ ہو۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تعلق جذبات سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں جذبات کا دخل نہیں ہوتا وہاں بھی اسی طرح اخبار آحاد کی امکانی جانچ پڑتال کر کے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دیتے ہیں اور اگرچہ اس ترجیح سے صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے لیکن اس ظن پر ہم اسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح علم یقین حاصل ہونے کی صورت میں کرتے۔ ہماری زندگی کے معاملات میں سب سے زیادہ اور اہم اور نازک معاملہ عدالت کا ہے جس میں جذبات کا ذرہ برابر دخل نہیں بلکہ خالص

اور ٹھوس عقلی امتحان پر احکام کی بنا رکھی جاتی ہے۔ قاضی یا جج کے سامنے جتنے معاملات پیش ہوتے ہیں ان سب کا تعلق گذرے ہوئے واقعات سے ہوتا ہے اور بہت واقعات بلکہ شاذونادر ایسے ہوتے ہیں جن میں شہادتیں تواتر کی حد تک پہونچتی ہوں، بیشتر معاملات میں جج کے سامنے صرف "اخبار آحاد" پیش ہوتی ہیں۔ جنھیں وہ تعدیل وجرح، قرائن وآثار اور قیاس عقلی کی کسوٹی پر کس کر سچ اور جھوٹ کے امکانی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو راجح قرار دیتا ہے اور جب کوئی پہلو راجح ہو جاتا ہے تو اس پر وہ اس طرح فیصلہ کرتا ہے جیسے اس کے نزدیک واقعہ یقین کی حد تک ثابت ہو گیا ہے۔ اگر کوئی جج ہر شاہد کو جھوٹا اور ہر شہادت کو غلط فرض کر کے اپنا کام شروع کرے اور ہر واقعہ کو تسلیم کرنے کے لیے اس بات پر اصرار کرے کہ یا تو واقعہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے یا متواتر روایات اس تک پہونچیں۔ تو یقیناً چند ہی ساعتوں میں اس کو عدالت کی کرسی چھوڑ دینی پڑے گی۔

اس طرح تجارت، تدبیر سلطنت اور دوسرے دنیوی کاروبار میں بھی رات دن اخبار احاد پر ہمارے معاملات چلتے ہیں بلکہ بہت سی خبریں تو ہم کو تار اور اخبارات کے ذریعہ سے ملتی ہیں جن کی صحت میں عقلاً بہت سے شکوک وشبہات کی گنجائش نکلتی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس شخص نے ہم کو تار دیا ہے وہ درحقیقت وہی شخص ہے جس کا نام تار پر لکھا ہوا ہے اور اگر تار فی الواقع اسی کا دیا ہوا ہے تب بھی ہم کو نہیں معلوم کہ جو خبر وہ دے رہا ہے وہ اسے کس ذریعہ سے معلوم ہوئی؟ اور اس کا ذریعہ معتبر ہے یا نہیں؟ اس قسم کے بہت سے احتمالات ہر تار کی خبر میں ہوتے ہیں لیکن جن لوگوں کا سارا کاروبار انہی خبروں پر چلتا ہے وہ ان احتمالات کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ محض ظاہری قرائن سے یہ جانچ لیتے ہیں کہ تار انہی کے ایجنٹ کا دیا ہوا ہے یا نہیں؟ اور جب ایک ظن

غالب ان کو حاصل ہو جاتا ہے تو اس پر اپنے لاکھوں روپے لگا دیتے ہیں۔

یہی صورت مذہبی معاملات میں بھی ہے۔ سب سے بڑی بات جس پر ہمارے ایمان کا مدار ہے قرآن مجید ہے۔ اس کتاب کا کلام الٰہی ہونا ہم کو صرف ایک گواہ کی شہادت سے معلوم ہوا ہے اور وہ گواہ ذات رسالت پناہ ہے۔ نفس خبر ہونے کے لحاظ سے اس میں بھی صدق و کذب کا احتمال ہے۔ لیکن خبر جس گواہ نے دی ہے اس کی راست بازی دیانت، پاکیزہ سیرت کو دیکھ کر اور جو خبر اس نے دی ہے اس کی معقولیت اور حقانیت کا لحاظ کر کے ہم کذب کے پہلو پر صدق کے پہلو کو راجح قرار دیتے ہیں اور پھر یہی ترجیح ایمان بن کر ہمارے قلب میں راسخ ہو جاتی ہے کہ کذب کا تصور تک نہیں آنے پاتا لیکن دوسری طرف بہت سے لوگ ہیں جنھیں اس شاہد امین کی شہادت میں شک ہے اور اسی شک کی بنا پر وہ اس کی تصدیق سے انکار کر رہے ہیں ہم میں اور ان میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ ہم نے ایک راست باز گواہ کی گواہی کو تسلیم کیا اور مسلمان ہو گئے انھوں نے اس کی گواہی میں شک کیا اور کفر میں مبتلا ہو گئے۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ وحی اترتے ہوئے نہ ہم نے دیکھی اور نہ انھوں نے۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بالعموم اوسط درجہ کے انسان اپنی زندگی کے معاملات میں نہ اتنے ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں کہ ہر خبر کو بلا تحقیق و تفتیش قبول کر لیں اور نہ اتنے شکی اور وہمی ہوتے ہیں کہ ہر خبر کی صحت اور ہر راوی کی صداقت میں شبہ کریں۔ اور ہر معاملہ میں رائے قائم کرنے کے لیے اس علم یقین کا مطالبہ کریں جو صرف تجربہ و مشاہدہ اور روایتِ متواترہ سے حاصل

ہوتا ہے ان دونوں انتہاؤں کے مابین عقل سلیم اور معتدل فطرت رکھنے والے انسانوں کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ خبروں اور روایتوں کو امکانی ذرائع تحقیق سے کام لے کر جانچتے ہیں اور اس جانچ پڑتال میں اگر ان کے غلط ہونے کا گمان غالب (نہ کہ یقین) ہوتا ہے تو انھیں رد کر دیتے ہیں اور اگر ان کے صحیح ہونے کا گمان غالب (نہ کہ یقین) حاصل ہو جاتا ہے تو ان کو قبول کر کے انھیں کے مطابق عمل کرتے ہیں تحقیق اور جانچ پڑتال کا معیار بھی تمام خبروں کے لیے یکساں نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے سخت اور نرم ہونے کا انحصار خبر کی نوعیت اور اس معاملہ کی اہمیت پر ہوتا ہے جس سے اس خبر کا تعلق ہے۔

یہ تو اس مسئلہ کی علمی حیثیت تھی۔ اب اگر آپ عقلی حیثیت سے بھی غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہی اعتدال کا طریقہ عین مطابقِ عقل ہے اور اس کے خلاف ضعیف الاعتقادی اور وہمی پن دونوں خلاف عقل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عقل کے نزدیک ہر واقعہ میں شک کرنا ممکن ہے حتیٰ کہ مشاہدات اور محسوسات تک میں بھی شک کیا جا سکتا ہے لیکن یہ لازم نہیں کہ ہر فعل جو کیا جا سکتا ہو اس کا کرنا عقل کے نزدیک درست اور احسن بھی ہو۔ مزید برآں عقل ہر خبر کے متعلق صرف یہ حکم لگاتی ہے کہ اس میں صدق اور کذب کا یکساں احتمال ہے۔ یعنی محض خبر ہونے کی حیثیت سے وہ سچ اور جھوٹ ہونے کا مساوی امکان رکھتی ہے اور جب تک کوئی معقول وجہ کسی ایک پہلو کو ترجیح دینے کے لیے موجود نہ ہو کسی خبر کو نہ سچ کہا جا سکتا ہے اور نہ جھوٹ۔ لیکن کوئی خبر ہم کو محض خبر ہونے کی حیثیت سے نہیں پہونچتی۔ بلکہ اس کے ساتھ لازماً بہت سے قرائن بھی ہوتے ہیں جن

سے تصدیق یا تکذیب کی جانب پلڑا ضرور جھکتا ہے۔ خالص شک کا مقام یعنی جہاں نہ تصدیق ہو اور نہ تکذیب، ایک ایسا باریک مقام ہے کہ انسان کا ذہن چند لمحے بھی اس پر نہیں ٹھہر سکتا۔ اس لیے ہر خبر کو سنتے ہی ذہن فوراً ایسے وجوہ تلاش کرنے لگتا ہے جن سے مدد لے کر وہ شک کے مقام سے تصدیق یا تکذیب کی طرف پھر جائے۔ پھر یہ بات بالکل ذہن کے سلیم یا مریض ہونے پر موقوف ہے کہ وہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کو معقول وجوہ کے ساتھ ترجیح دیتا ہے یا غیر معقول وجوہ کے ساتھ۔ کسی خبر کا متواتر نہ ہونا یا خبر واحد ہونا عقلاً اس کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے کہ مجرّد اسی بنیاد پر اس کے غلط ہونے کا حکم لگا دیا جائے۔ نہ یہ بات کسی خبر کو جھوٹ قرار دینے کے لیے کافی اور معقول وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ بہت قدیم زمانہ سے متعلق ہے۔ اور ہم تک بہت سے واسطوں سے پہنچی ہے۔ نہ کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ فرض کر سکتا ہے کہ ہر مخبر جھوٹا ہوتا ہے اور دنیا کے تمام مخبر آپس میں متفق ہو کر جھوٹی خبریں دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اس قسم کے تمام مفروضات جو تکذیبی ذہنیت سے دیکھنے والوں کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتے ہیں اور جن کی بنا پر وہ ہر خبر کی تکذیب کی طرف مائل ہو جایا کرتے ہیں قطعاً خلافِ عقل ہیں اور اسی طرح اس کے برعکس جن مفروضات کی بنا پر ہر خبر اور ہر مخبر کی تصدیق کی جاتی ہے وہ بھی عقل کے مطابق نہیں ہیں۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان صحیح راستہ جو ایک سلیم الفطرت ذہن اختیار کرتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ مجموعاً تمام خبروں کی نہ تصدیق کرے گا اور نہ تکذیب، بلکہ وہ ہر خبر کو فرداً فرداً لے کر اس کے مخصوص حالات کے لحاظ سے تحقیق و تفتیش کے ایک خاص معیار پر جانچے گا اور

جب اس تحقیق کے ذریعہ سے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کی طرف گمانِ غالب حاصل ہو جائے گا تو اسی پہلو کا حکم لگا دے گا۔

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کسی خبر کی تحقیق کا سخت سے سخت قابل عمل معیار کیا ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے، زید نام کا ایک شخص اب سے سو برس پہلے گذرا ہے جس کے متعلق عمرو ایک روایت آپ تک پہنچاتا ہے۔ آپ کو تحقیق کرنا ہے کہ زید کے متعلق یہ روایت درست ہے یا نہیں؟ اس غرض کے لیے آپ حسب ذیل تنقیحات قائم کر سکتے ہیں۔

(۱) یہ روایت عمر تک کس طریقے سے پہونچی؟ درمیان میں جو واسطے ہیں ان کا سلسلہ زید تک پہونچتا ہے یا نہیں۔؟ درمیانی راویوں سے ہر راوی نے جس شخص سے روایت کی ہے اس سے وہ ملا بھی تھا یا نہیں؟ ہر راوی نے روایت کس عمر اور کس حالت میں سنی؟ روایت کو اس نے لفظ بلفظ نقل کیا یا اس کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں ادا کیا؟

(۲) کیا یہی روایت دوسرے طریقوں سے بھی منقول ہے؟ اگر منقول ہے تو سب بیانات متفق ہیں یا مختلف؟ اور اختلاف ہے تو کس حد تک؟ اگر کھلا ہوا اختلاف ہے تو مختلف طریقوں میں سے کون سا طریق روایت زیادہ معتبر ہے؟

(۳) جن لوگوں کے واسطے سے یہ خبر پہونچی ہے وہ خود کیسے ہیں؟ جھوٹے یا بددیانت تو نہیں؟ اس روایت میں ان کی کوئی ذاتی یا جماعتی غرض تو نہیں تھی؟ ان میں صحیح یاد رکھنے اور صحیح نقل کرنے کی قابلیت تھی یا نہیں؟

(۴) زید کی افتادِ طبع، اس کی سیرت، اس کے خیالات اور اس کے ماحول کے متعلق جو مشہور و متواتر روایات یا ثابت شدہ معلومات ہمارے پاس موجود ہیں یہ روایت ان کے خلاف تو نہیں ہے۔؟

(۵) روایت کسی غیر معمولی اور بعید از قیاس امر کے متعلق ہے یا معمولی اور قرین قیاس امر کے متعلق ؟ اگر پہلی صورت ہے تو کیا طریق روایت اتنے کثیر اور مسلسل اور معتبر ہیں کہ ایسے امر کو تسلیم کیا جا سکے۔؟ اور اگر دوسری صورت ہے تو کیا روایت اپنی موجودہ شکل میں اس امر کی صحت کا اطمینان کرنے کے لیے کافی ہے ؟

یہی پانچ پہلو ہیں جن سے کسی خبر کی جانچ پڑتال کی جا سکتی ہے۔ ان سوالات کے متعلق اگر ذرائع تحقیق ہمارے پاس موجود ہوں اور ان ذرائع سے کوئی خبر تحقیق کے معیار پر پوری اتر جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی تکذیب کریں اور اگر کوئی خبر اس معیار پر پوری نہ اترے تو ہم کو حق ہے خواہ اس کی تکذیب کریں یا اس کو رد کریں۔ لیکن اگر ذرائع تحقیق موجود ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص فرداً فرداً ہر چیز کو جانچنے اور اس کے متعلق رائے قائم کرنے کے بجائے تمام خبروں کو مجموعاً محض اس بنا پر رد کر دے یا جھوٹ قرار دے کہ ان میں بعض جعلی خبریں ملی ہوئی ہیں یا بعض راویوں کی کمزوریاں ثابت ہیں۔ یا بعض اس شخص کی عقل میں نہیں سماتیں تو اس سے بڑھ کر غیر معقول طرز عمل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس تمہیدی بیان نے معاملہ کو بالکل صاف کر دیا ہے اور کوئی شخص

ذاتِ رسالت پناہ کے اسوۂ حسنہ اور سنت مطہرہ سے کوئی تعلق رکھنا ہی نہ چاہتا ہو تو یہ ایک دوسری بات ہے۔ لیکن اگر وہ آنحضرتؐ کی تقلید ضروری سمجھتا ہے اور اسے واقعی یہ معلوم کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ حضورؐ نے اپنی ۲۳ سال کی حیاتِ نبوی میں کس طرح زندگی بسر کی؟ کون سے افعال کیے؟ کن افعال سے اجتناب کیا کن باتوں کو جائز رکھا؟ کن باتوں سے منع فرمایا؟ تو لامحالہ اس کو حدیث کے ذخیرے کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔ یہاں وہ دیکھے گا کہ اس وقت بھی دنیا میں کم و بیش چار پانچ لاکھ آدمی ایسے موجود ہیں جن کے پاس حدیث کی کتابیں امام مالکؒ امام محمدؒ، امام شافعیؒ امام احمد بن حنبل، امام بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث سے سلسلہ بہ سلسلہ پہنچی ہیں، اس لیے اس امر میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ کتابیں انہی بزرگوں کی لکھی ہوئی ہیں پھر اس میں بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان بزرگوں نے ہر حدیث کو جو سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام تک پہنچائی ہے، وہ کم از کم ان کی تحقیق کے لحاظ سے درست تھی۔ لہٰذا ان کتابوں کے ذریعہ سے حدیث کا وہ علم قریب قریب یقینی طور پر ہم تک پہنچ گیا ہے۔ جو پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی صدی ہجری کے ائمۂ حدیث کے پاس تھا۔ اس کے علاوہ احادیث کے متعلق وہ تمام معلومات بھی معتبر کتابوں کے ذریعہ سے ہم تک پہنچ گئی ہیں۔ جن سے کام لے کر ان محدثین نے حدیثوں اور ان کے راویوں کے حالات کی جانچ پڑتال کی تھی۔ اوپر ہم نے ایک خبر کی تحقیق کے لیے جو تنقیحی سوالات قائم کیے تھے ان میں سے ہر سوال کا مفصل جواب قریب قریب ہر حدیث کے متعلق ہم کو ان کتابوں میں مل جاتا ہے۔

پچھلے محدثین کے درمیان احادیث اور ان کی تحقیق کے بارے میں جو اختلاف آراء ہوئے ہیں

وہ بھی تمام دلائل اور وجوہ کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اس وسیع مفصل اور زیادہ سے زیادہ امکانی وثوق رکھنے والے ذخیرے کے موجود ہوتے ہوئے کوئی صاحب عقل انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی واقعہ اور آنحضرتؐ کا کوئی ارشاد آج دنیا میں صحت کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ ایسا دعویٰ کرنے والے کو سب سے پہلے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ عہد رسالت سے لے کر ہمارے زمانے تک جو لاکھوں سے متجاوز اور کروڑوں تک پہنچے ہوئے مسلمان احادیث نبوی کے نقل کرنے اور سننے سنانے میں مشغول رہے ہیں وہ سب کے سب یا ان میں سے اکثر جھوٹے تھے اور انھوں نے بالاتفاق یہ طے کر لیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت گھڑنے اور اس طریقے سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور اسلام کو تباہ و برباد کرنے ہی میں اپنی عمر بسر کریں گے۔ اگر کوئی منکر حدیث اس امر کا ثبوت رکھتا ہے تو وہ اس کو پیش کرے ہم اسے یقین دلاتے ہیں کہ ساری دنیا کے محققین اور مکتشفین کے کارنامے اس کی اس نادر تحقیق کے سامنے دب جائیں گے لیکن اگر ان کے پاس بدگمانی اور جھوٹے الزامات اور کُل پر بعض کا حکم لگانے کے مغالطہ انگیز اور خلاف عقل و دیانت طریقوں کے سوا اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کو وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہوں تو انھیں کم از کم یہ امید تو نہ رکھنی چاہیے کہ جن لوگوں کی عقل درست ہے اور جو فطرتِ سلیمہ سے بہرہ ور ہیں وہ بھی ان کے دعوے کو تسلیم کر کے حدیث کی ساری خبروں کو مجموعی حیثیت سے غلط اور قابلِ رد قرار دیں گے۔

ہم نے کبھی اس خیال کی تائید نہیں کی کہ ہر شخص کو ائمۂ حدیث کی اندھی تقلید کرنی چاہیے یا ان کو غلطی سے مبرّا سمجھنا چاہیے۔ نہ ہم نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ ہر کتاب

میں جو روایت "قال رسول اللہ" سے شروع ہو اس کو آنکھیں بند کر کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث مان لیا جائے۔ برعکس اس کے ہمارے نزدیک کسی حدیث کو حدیثِ رسول قرار دینے کی ذمہ داری ایک گراں بار ذمہ داری ہے جس کو اٹھانے کی جرأت کافی تحقیق کے بغیر ہرگز نہ کرنی چاہئے۔ اور تحقیق و اجتہاد کے متعلق بھی ہمارا مذہب یہ ہے کہ اس کا دروازہ ہر زمانہ میں کھلا ہوا ہے۔ اور کسی خاص عہد کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جن لوگوں نے فن حدیث کی تحصیل اور اس کے باقاعدہ مطالعہ اور تحقیقات میں پورا ایک مہینہ بھی صرف نہیں کیا ہے وہ ان بزرگوں کے کارناموں پر تنقید کریں جنھوں نے پوری پوری عمریں اس فن کی خدمت میں صرف کر دی ہیں۔ صرف ایک فنِ حدیث ہی پر موقوف نہیں ہے دنیا کا کوئی علم و فن بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جس میں مبتدیوں اور اناڑیوں کو ریسرچ اور ماہرانہ اظہار رائے اور مجتہدانہ کلام کا حق دیا جاتا ہو۔ یہ حق انسان کو صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ فن کے مبادی و اصول پر پوری طرح حاوی ہو چکا ہو۔ اور جتنا ذخیرہ معلومات اس فن کے متعلق موجود ہو وہ سب اس کی نظر میں ہو۔ باقی رہا وہ شخص جو ابھی اس مرتبہ تک نہیں پہونچا ہے تو اس کے لیے سلامتی اسی میں ہے کہ وہ ائمۂ فن کی تحقیقات اور ان کی آراء کا اتباع کرے۔ تمام دنیوی علوم کی طرح مذہبی علوم میں بھی یہی طریقہ بہتر اور صحیح تر ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو لوگ اجتہاد بلا علم کا عَلَم بلند کرتے ہیں وہ دنیا اور دین دونوں میں اپنے لیے رسوائی کا سامان کرتے ہیں۔

(ترجمان القرآن صفر ۵۳ھ، جون ۳۴ء)

حدیث کے متعلق چند سوالات!

ناظرین "ترجمان القرآن" میں سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"منکرین حدیث" کے جواب میں آپ کا فاضلانہ مضمون مندرجہ ترجمان القرآن پڑھ کر بہت مسرت ہوئی، جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ اسی سلسلہ میں اگر جناب ذیل کے امور پر مزید روشنی ڈالیں تو ذی علم احباب کے لیے عموماً اور ناظرین رسالہ کے لیے خصوصاً بہت مفید ہوگا۔

(۱) حفاظت قرآن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر کہ لا تکتبوا عنی سوی القرآن ایک ضروری احتیاط کی صورت پیدا کر دی تھی۔ صحابۂ کرامؓ قرأت و حفظِ قرآن کما نُزِّلَ کے لیے مامور تھے اور اسی پر عامل رہے۔ باوجود اس کے اختلاف قرأت پیدا ہوا جس کا دفعیہ بعہد حضرت عثمانؓ ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ احادیث بمقابلہ قرآن ویسی محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ خصوصاً جبکہ فتن جمل و صفین کے بعد مدت تک ان کی جمع و تنقید کی مختلف ذرائع سے کوشش کی گئی جبکہ

طرق، رواۃ اور موضوعات کی چھان بین بہت مشکل تھی۔

(۲) احادیث فعلی اور قولی میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہئے تھا۔ مثلاً احادیث فعلی میں سے کیفیت و ہیئت نماز کے متعلق عقل چاہتی ہے کہ مطلقاً کسی قسم کا اختلاف نہ ہو۔
خصوصاً جبکہ ارشاد نبوی تھا کہ صلوا کما رأیتمونی اصلی کم از کم حرمین شریفین میں دن رات پانچ مرتبہ ایک گروہ کثیر ہر زمانہ میں متواتر اس عمل کا مشاہدہ کرتا رہا ہے مگر ابتدائے زمانہ میں ائمۂ مجتہدین کا اختلاف جو بصورت رفع یدین، ارسال یدین[1]، وضع یدین[2]، تامین بالجہر وغیرہا ظاہر ہوا۔ اس تواتر فعلی کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے اور تواتر قولی کی حیثیت اور بھی گر جاتی ہے، خبر احاد کا کیا کہنا۔

(۳) اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہمارے لیے عملی طور پر سبق آموز ہے۔ قرون اولیٰ میں جب تک کہ جمع احادیث کا تسلی بخش اہتمام نہ ہو سکا قرنیین عظیم کے باہر مسلمان قرآن مجید ہی سے اسوۂ نبی کا اقتباس کرتے تھے۔ اخلاق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا اور آپ نے جواباً فرمایا کان خُلقه القرآن غرض قرآن پاک سے اسلامی اخلاقی

---

[1] ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا جس طرح حضرات شیعہ پڑھتے ہیں۔

[2] ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا جس طرح اہل سنت پڑھتے ہیں۔

اور زندگی معلوم کرنے کے لیے ذخیرہ وافر ہے۔ فی زمانہ بھی بہت
تھوڑے ہیں جن کو پیغمبر اسلام علیہ الصلوات والتحیات کی سوانح
بالتفصیل والصواب معلوم ہوں، مگر متبعین شریعت عموماً اصول و
ارکانِ اسلام سے واقف ہیں اور یہی مقصود بالذات تھا۔
مذکورہ بالا بعض منکرین حجیّت حدیث کے شبہات ہیں جن کا ازالہ
فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ ورنہ خاکسار مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا
نَہٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَہُوْا ، کو صحیح معنوں میں لے کر حجیّت حدیث
صحیح کا قائل ہے۔"

آپ نے جن اعتراضات کی طرف توجہ دلائی ہے ان کے علاوہ بیسیوں اور
اعتراضات بھی ہیں جو منکرین حدیث کی جانب سے پیش کیے جاتے ہیں مگر ان جزئی
باتوں پر جُدا جُدا بحث کرنا طول کلام کا موجب ہے اور غیر ضروری بھی۔ اصل بات یہ ہے
کہ انسان کی رائے کا تمام تر انحصار اس کے نقطۂ نظر پر ہے۔ جب کسی مسئلہ پر وہ
مخالف نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا ہے تو اس کو تمام مخالف ہی مخالف دلائل ملتے چلے جاتے
ہیں۔ اور جب موافق نقطہ نظر سے دیکھتا ہے تو تمام دلائل موافقت ہی میں نظر آتے
ہیں۔ مگر جب خالی الذہن ہو کر تلاشِ حق کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو مخالف اور
موافق دونوں قسم کے دلائل پر اس کی نظر پڑتی ہے اور دونوں میں موازنہ کر کے وہ
ایک معتدل رائے قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اعدائے اسلام کے حملوں سے
متاثر ہو کر، یا غیر محتاط علما کی روایات سے دل برداشتہ ہو کر احادیث سے بدظن ہو
چکے ہیں۔ وہ جب مخالفانہ ذہنیت کے ساتھ احادیث پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو

حدیثوں کے ناقابلِ احتجاج ہونے کے لیے دلائل پر دلائل ملتے چلے جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے جو لوگ قدامت پسندی کے ماحول میں پرورش پائے ہوئے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ہر حدیث کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو، بے چون وچرا مان لیتے ہیں خواہ وہ ضعیف بلکہ موضوع ہی کیوں نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں اور جب غلط نقطۂ نظر ہیں تو جو کچھ ان نقطوں سے دیکھا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ تمام احادیث کو مطلقاً غلط سمجھنے والے بھی غلطی پر ہیں اور تمام احادیث کو مطلقاً صحیح سمجھنے والے بھی راہ راست سے ہٹ گئے ہیں جو احادیث اور قرآن مجید میں فرق نہیں کرتے، اور وہ لوگ بھی گمراہی میں مبتلا ہیں جو احادیث کو قطعاً ناقابل احتجاج قرار دیتے ہیں۔ صحیح راستہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے اور وہ درمیانی راستہ نظر نہیں آسکتا جب تک کہ دیکھنے والا ان متضاد نقطوں سے ہٹ کر وسط کے نقطہ پر نہ آجائے۔ پس اصلاح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جزئیات میں الجھنے کے بجائے انتہا پسندوں کے نقطۂ نظر پر براہ راست حملہ کیا جائے اور ان کو وہاں سے ہٹا کر صحیح نقطۂ نظر پر کھینچ لایا جائے۔

تاہم جب آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بیان کردہ امور پر روشنی ڈالی جائے تو مختصراً میں ان پر اظہار رائے کیے دیتا ہوں۔

۱۔ یہ خیال صحیح ہے کہ احادیث اس حد تک محفوظ نہیں ہے جس حد تک قرآن مجید ہے مگر اس سے تجاوز کر کے یہ فرض کر لینا صحیح نہ ہو گا کہ وہ مطلقاً محفوظ ہی نہیں ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول اور عمل ہم تک صحت کے ساتھ پہنچا ہی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ روایات کے طریقوں اور راویوں

کے احوال کی چھان بین میں بہت دقتیں پیش آئی ہیں اور ان میں محدثین کے درمیان اختلافات بھی ہوئے ہیں۔ مگر فنِ حدیث کی تاریخ شاہد ہے کہ محدثین نے تحقیق و تفتیش کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے اور اس کام میں اتنی محنتیں کی ہیں کہ ان سے زیادہ انسان کے بس میں نہ تھیں۔ انہوں نے اپنی محنتوں سے جو ذخیرہ فراہم کیا ہے وہ آج ہمارے پاس موجود ہے اور ان کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں وہ بھی تمام دلائل اور شواہد کے ساتھ موجود ہیں۔ اگر کوئی اس ذخیرہ پر تحقیق کی نظر ڈالے تو اس کے لیئے آج تیرہ سو برس گذر جانے کے بعد بھی یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا اور کیا نہیں فرمایا، کیا کیا اور کیا نہیں کیا، اور یہ کہ ہر روایت جو آپ کی طرف منسوب ہے وہ اپنی صحت اور قابل احتجاج ہونے کے لحاظ سے کیا پایہ رکھتی ہے لیکن یہ بات ناقابل انکار ہے کہ علم کا جیسا مستند اور معتبر ذریعہ قرآن مجید ہے ویسا مستند اور معتبر ذریعہ حدیث نہیں ہے۔ اس لئے صحت کا اصلی معیار قرآن ہی ہونا چاہیئے۔ جو چیز قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے مخالف ہوگی، اسے ہم یقیناً رد کر دیں گے اور اس کا مخالف قرآن ہونا ہی اس امر کا بیّن ثبوت ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ چیز ہرگز ثابت نہیں ہے اور جو چیز قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے موافق ہوگی اور تعلیمات قرآن کی ایسی توضیح و تشریح یا احکام کی ایسی تفصیل ہوگی جو قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے خلاف نہ ہو[1]۔

---

[1] واضح رہے کہ قرآن کے خلاف ہونا اور چیز ہے اور قرآن سے زائد ہونا اور چیز۔ بعض لوگ اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے اور حدیث میں جو باتیں قرآنی اجمال سے زائد ملتی ہیں ان کو قرآن کے خلاف قرار دینے لگتے ہیں اس پر تفصیلی کلام بعد والے مضمون میں کیا گیا ہے۔

اور روایت و درایت کے طریقوں سے اس کے معتبر ہوتے کا ظن غالب بھی ہو جائے گا۔ اس کو ہم ضرور تسلیم کریں گے اور اپنی عقلی تفسیر و تشریح اور اپنی رائے پر اس کو ترجیح دیں گے۔

۲۔ بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیئے جن کو دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں. ان میں اختلافات نہ پایا جانا چاہیئے۔ لیکن ہر شخص بہ ادنیٰ تامّل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو اس کو نقل کرنے یا اس کو مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس قدر متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان ایک سرمو فرق نہ پایا جائے۔ اس واقعہ یا اس تقریر کے اہم اجزاء میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا مگر فرعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائے گا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹہ بعد) لوگوں سے پوچھ لیجئے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا، کوئی کسی ٹکڑے کو، کوئی کسی جملے کو لفظ بہ لفظ نقل کریگا، کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کردے گا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کردیگا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح ادا نہ کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور

وہ تقریر کے اکثر حصّے لفظ بلفظ نقل کر دیگا کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی اور وہ نقل و روایت میں غلطیاں کریگا۔ اب اگر کوئی شخص اس اختلاف کو دیکھ کر یہ کہدے کہ میں نے سرے سے کوئی تقریر ہی نہیں کی تھی یا وہ از سرتا پا غلط نقل کی گئی تو صحیح نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر تقریر کے متعلق تمام اخبار احاد کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس امر میں سب کے درمیان اتفاق ہے کہ میں نے تقریر کی، فلاں جگہ کی، فلاں وقت کی، بہت سے آدمی موجود تھے اور تقریر کا موضوع یہ تھا۔ پھر تقریر کے جن جن حصّوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ اتفاق لفظاً یا معنًی پایا جائے گا وہ زیادہ مستند سمجھے جائیں گے۔ اور ان سب کو ملا کر تقریر کا ایک مستند مجموعہ تیار کر لیا جائیگا اور جن حصّوں کے بیان کرنے میں ہر راوی منفرد ہوگا وہ نسبتاً کم معتبر ہوں گے مگر ان کو موضوع اور غلط کہنا جائز نہ ہوگا۔ تاوقتیکہ وہ تقریر کی پوری اسپرٹ کے خلاف نہ ہوں، یا کوئی ایسی بات ان میں نہ ہو جس کی وجہ سے ان کی صحت مشتبہ ہو جائے مثلاً تقریر کے معتبر حصّوں سے مختلف ہونا یا مقرر کے خیالات اور انداز بیان اور افتاد مزاج کے متعلق جو صحیح معلومات لوگوں کے پاس پہلے سے موجود ہیں ان کے خلاف ہونا۔

یہی حال احادیث فعلی کا ہے۔ آپ نے نماز کی مثال پیش فرمائی ہے میں بھی اسی مثال کو سامنے رکھ کر جواب عرض کرتا ہوں۔ نماز کے متعلق تواتر قولی و عملی سے یہ بات متفقہ طور پر ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانچ وقت کی نماز فرض ادا فرماتے تھے، نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی، مقتدی آپ کے پیچھے صف بستہ کھڑے ہوتے اور آپ کی حرکات و سکنات کی پیروی کرتے تھے،

آپ قبلہ کی طرف رُخ فرمایا کرتے، تکبیر تحریمہ کے ساتھ نماز میں داخل ہوتے، قیام رکوع، سجود اور قعود سے نماز مرکب ہوتی تھی۔ یا ہر رکن نماز کی فلاں فلاں ہیئتیں تھیں غرض نماز کے جتنے اہم اجزاءِ ترکیبی ہیں ان سب میں تمام زبانی روایات متفق ہیں اور عہدِ رسالت سے آج تک ان کے مطابق عمل بھی ہو رہا ہے۔ اب رہے جزئیات مثلاً رفع یدین اور وضع یدین وغیرہ تو ان کا اختلاف یہ معنی نہیں رکھتا کہ نماز کے متعلق تمام روایات غلط ہیں۔ بلکہ دراصل یہ اختلاف اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مختلف دیکھا۔ چونکہ یہ امور نماز میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اور ان میں سے کسی کے کرنے یا نہ کرنے سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور حضورؐ خود صاحب شریعت تھے اس لیے آپ جس وقت جیسا چاہتے تھے عمل فرماتے تھے لیکن حضور کے سوا کوئی اور شخص چونکہ صاحب شریعت نہ تھا اور اس کا کام اتباع تھا نہ کہ تشریع اس لیے ہر دیکھنے والے نے آپ کو جیسا فعل کرتے دیکھا اسی کی پیروی کے لئے لوگوں سے کہا۔ بعد کے ائمہ نے روایات کی چھان بین کر کے ہر جزئیہ کے متعلق یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ زیادہ صحیح اور مستند روایات کون سی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تحقیق کے نتائج میں اختلاف ہونا ممکن تھا اور وہ ہوا۔ کسی نے کسی روایت کو مستند سمجھا اور کسی کو اس کے خلاف روایت پر اطمینان حاصل ہوا۔ مگر یہ اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور یہ ہرگز اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ ادائے نماز کے متعلق سرے سے کوئی قولی وفعلی تواتر ہی نہیں پایا جاتا۔

۳۔ قرآن پاک اور حدیث نبوی کے تعلق کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے سے تیسرا

سوال پیدا ہوا ہے۔ قرآن پاک میں سب سے زیادہ زور ایمان پر دیا گیا ہے اور ایمان ہی کی تفصیلات سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے اسکے لیے تو ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں اور حدیث میں اس سے زیادہ کوئی چیز ملتی بھی نہیں ہے۔
اس کے بعد اخلاقی تعلیمات ہیں۔ قرآن میں اصول اخلاق قریب قریب سب کے سب بیان کر دیئے گئے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اخلاق کا تعلق لفظی بیان سے اتنا نہیں ہے جتنا عملی نمونہ سے ہے۔ اس لیے خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اخلاق کا مجسم نمونہ بنا کر پیش فرمایا۔ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور اپنے مواعظ اور اپنی تعلیم حکمت اور عملی تربیت و تزکیۂ نفوس سے ان تمام اصول اخلاق کی قولی و عملی تشریح فرمادی جو قرآن مجید میں بیان ہوئے۔ پس جو شخص اس اسوۂ نبوی کو چھوڑ کر کہتا ہے کہ اس باب میں ہمارے لیے صرف قرآن کافی ہے وہ اپنے آپ کو بہت بڑی نعمت سے محروم کرتا ہے بلکہ درحقیقت وہ حق تعالیٰ کے اس فعل کو عبث سمجھتا ہے کہ اس نے تنزیل کتاب کے ساتھ رسول بھی مبعوث فرمایا اور یہ کہہ کر مبعوث فرمایا کہ ہمارا رسول نہ صرف تم کو ہماری آیات سنائے گا بلکہ تمہارا تزکیۂ نفس بھی کرے گا، تم کو کتاب وحکمت کی تعلیم بھی کرے گا اور اس کی زندگی میں تمہارے لیے اسوۂ حسنہ بھی ہو گا۔

اب رہ گئے احکام تو قرآن مجید میں ان کے لیے زیادہ تر کلی قوانین بیان کیے گئے ہیں۔ اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے عمل اور قول کی تفصیلات ظاہر فرمائیں ان تفصیلات میں سے بعض ایسی ہیں جن میں ہمارے

اجتہاد کو کوئی دخل نہیں، ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضور سے ثابت ہے اسی کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے احکام، اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کرکے اپنے اجتہاد سے فروع اخذ کر سکتے ہیں۔ مثلاً عہد نبوی کے قوانین مدنی اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی اسپرٹ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری ہو جائے تو ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پر ایک مسلمان کی سی ذہنیت اور ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں۔ دنیا کے عملی اور علمی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ان کے متعلق ویسی ہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی چاہیئے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ پورا اور پکا مسلمان بننے کے لیے قرآن مجید کے ساتھ حدیث کا علم کس قدر ضروری ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ ایک عام مسلمان حدیث کے علم کے بغیر بھی ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کرتا ہے تو میں کہوں کہ یہ علم حدیث کی ضرورت نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے اور اگر یہ دلیل ہے تو یہی دلیل قرآن کے علم کی ضرورت نہ ہونے پر بھی قائم کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ایک عامی مسلمان قرآن کے علم سے بھی بہت کم بہرہ ور ہوتا ہے اور پھر بھی اپنی زندگی میں احکام شریعت کا اتباع کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عامی لوگ نہ کبھی عہد نبوی میں معیاری مسلمان تھے اور نہ اس کے بعد کبھی ان کو معیاری مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ معیاری مسلمان تو دراصل اس زمانے میں بھی وہی تھے اور اب بھی وہی ہیں جو قرآن اور حدیث کے علوم پر نظر رکھتے ہیں اور جن کی

رگ وپے میں قرآن کا علم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا نمونہ سرایت کر گیا ہو۔ باقی رہے عوام تو وہ اس وقت بھی ان معیاری مسلمانوں کے پیرو تھے اور آج بھی ہیں۔ عہدِ نبوی میں جن صحابہ نے جتنا زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحبت اور تعلیم کا فیض اٹھایا وہ اتنے ہی زیادہ معیاری مسلمان سمجھے گئے اور ان کے مقابلہ میں کبھی ان لوگوں کو باعتبار علم یا باعتبار عمل ترجیح نہیں دی گئی جنہوں نے آنحضرتؐ سے تعلیم اور صحبت کا فیض نہ اٹھایا تھا۔ بلاشبہ مسلمان دونوں تھے مگر دونوں کے مراتب کا فرق کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاوّل ۵۳ھ، جولائی ۳۴ء)

قرآن اور سنّت رسولؐ

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"میں متواتر ضرورتِ حدیث کے سلسلہ میں آپ کے مضامین دیکھ چکا ہوں میں نہ تو ان غالی مخالفین حدیث میں سے ہوں کہ کسی قولِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھکرا دوں اور نہ کورانہ روایات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ سے ان دونوں مسائل کے بارے میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری اور میرے احباب کی تسلی فرمائیں۔

۱۔ آیا قرآن مجید نجات کے لیے کافی ہے یا نہیں؟ اگر کافی ہے تو تفصیلاتِ نماز وغیرہ جو غیر از قرآن ہیں، کیوں فریضۂ اولین قرار دی جائیں؟

۲۔ مزید قابل غور امر یہ ہے کہ باقی ارکان اسلام روزہ، زکوٰۃ، حج (جو سال میں یا عمر بھر میں ایک دفعہ ادا کرنے ضروری ہیں) کی تفصیلات تو قرآن بیان

کرتا ہے لیکن نماز جو ایک دن میں پانچ دفعہ ادا کرنی ضروری ہے اس کی
تفصیلات کیوں بیان نہیں کرتا ؟

۳۔ الف۔ مسلمانوں کی تباہی کا سبب کیا روایات نہیں ہے ؟

ب۔ کوئی قوم جس کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہو اور جس کے لیے مختلف آرڈر موجود ہوں
اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک ایک آرڈر پر اصولی وحدت
نہیں ہو جائے کیا روایات کو قبول کرتے ہوئے مسلم قوم کے لیے آپ
ایک آرڈر کی توقع رکھ سکتے ہیں ؟ میرا ایمان ہے کہ اس وقت مسلمان
وحدت و یگانگت اور اتحاد ملی ہی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اصولاً
اس وحدت کا حل آپ کیا تجویز کریں گے۔ ؟"

آپ نے جو سوالات کیے ہیں وہ اتنے پیچیدہ نہیں ہیں کہ تھوڑے سے تامل سے خود آپ ہی ان کا جواب نہ پا لیتے۔ میرے ان مضامین میں بھی جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے ان میں سے بعض سوالات کا حل موجود ہے۔ تاہم جب آپ کو ان مسائل میں الجھن پیش آ رہی ہے اور کچھ دوسرے لوگ بھی اس الجھن میں مبتلا ہیں تو ان کی تشفی کے لیے مختصراً کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

۱۔ قرآن حکیم "نجات" کے لیے نہیں بلکہ ہدایت کے لیے کافی ہے۔ اس کا کام صحیح فکر اور صحیح عمل کی راہ بتانا ہے اور اس رہنمائی میں وہ یقیناً کافی ہے۔ مگر نجات کے لیے صرف قرآن کا پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم خلوص نیت کے ساتھ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلیں اور وہی اعتقاد رکھیں جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے۔ اور اسی قانون کے مطابق عمل کریں جس کے اصول

قرآن نے مقرر کیے ہیں۔

۲۔ ہدایت کے لیے قرآن کے کافی ہونے کا مفہوم بھی عام طور پر غلط سمجھا جاتا ہے۔ کسی کتاب کے متعلق جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی علم و فن کی تعلیم کے لیے کافی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس فن کے جتنے گُر ہیں یا اس علم کے جتنے اہم اصولی مسائل ہیں وہ سب اس کتاب میں آگئے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر شخص جو اس کتاب کے الفاظ کو پڑھ سکتا ہو، اس کے تمام مطالب پر حاوی ہو جائے گا اور محض کتاب کے مطالعہ ہی سے اس کو اپنے فن میں اتنی مہارت بھی حاصل ہو جائے گی کہ وہ عملاً اس سے کام لے سکے۔ کتاب اپنی جگہ کتنی ہی کامل سہی لیکن اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسری جانب خود طالب علم میں بھی ایک خاص استعداد موجود ہو اور ساتھ ہی ایک ماہر فن استاد بھی موجود ہو جو نہ صرف کتاب کے مطالب کی توضیح و تشریح کرے بلکہ مظاہرہ (EXPERIMENT) اور مشق و تمرین (EXER-CISE) کے ذریعہ سے فن کی وہ اصل تفصیلات بھی سکھا دے جو نہ تو کتاب میں پوری طرح بیان ہو سکتی ہیں اور نہ محض کتاب میں پڑھ لینے سے کوئی ان پر علم و عمل کے اعتبار سے حاوی ہو سکتا ہے۔ یہی حال قرآن مجید کا بھی ہے وہ اس لحاظ سے ہدایت کے لیے کافی ہے کہ اس میں وہ صحیح علم موجود ہے جس کی روشنی میں انسان صراط مستقیم پر چل سکتا ہے اور اس میں وہ تمام اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جن پر اللہ کا پسندیدہ دین قائم ہے مگر اس علم سے فائدہ اٹھانے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ طالب علم استفادہ کی خالص نیت رکھتا ہو اور ان مبادی سے واقف ہو جو قرآن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرے

یہ کہ ایک ماہر فن استاد موجود ہو، کتاب اللہ کے نکات سمجھائے، آیات کا صحیح معنی ومفہوم بتائے، احکام پر خود عمل کر کے بتائے، اور قوانین کو عملی زندگی میں نافذ کر کے ان کا تفصیلی ضابطہ مقرر کر دے۔ پہلی چیز کا تعلق ہر شخص کی اپنی ذات سے ہے۔ رہی دوسری چیز تو اس کا انتظام اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ کتاب کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی غرض سے بھیجا گیا تھا کہ آپ اس ماہر فن کی ضرورت کو پورا کریں آپ نے استاد کی حیثیت سے جو کچھ بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے اسکو غیر از قرآن کہنا صحیح نہیں ہے۔ جو شخص اسکی ضرورت کا منکر ہے اور قرآن کو اس معنیٰ میں کافی کہتا ہے کہ اس کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی و عملی ہدایت کی حاجت نہیں ہے۔ وہ دراصل یہ کہتا ہے کہ صرف قرآن کی تنزیل کافی تھی۔ خدا نے نعوذ باللہ یہ فعل عبث کیا کہ اس کے ساتھ رسول کو بھی مبعوث کیا۔

۳۔ آپ پوچھتے ہیں کہ "تفصیلات نماز وغیرہ جو غیر از قرآن ہیں۔ کیوں فریضۂ اوّلین قرار دی جائیں؟" اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تفصیلات نماز وغیرہ کو غیر از قرآن کہنا سرے ہی سے غلط ہے۔ اگر کوئی ماہر فن طبیب فن طب کے کسی قاعدے کو عملی تجربہ کر کے شاگردوں کو سمجھائے تو آپ اسے "خارج از فن" نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی پروفیسر اقلیدس کے کسی مسئلہ کو شکلیں کھینچ کر تشریح و تفصیل کے ساتھ سمجھائے تو آپ اسے "غیر از اقلیدس" نہیں کہہ سکتے۔ ہر علم وفن کے اصولی کتابوں میں صرف اصول اور مہمات مسائل بیان کر دیئے جاتے ہیں اور عملی تفصیلات استاد کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ کیوں کہ استاد عملی مظاہروں

سے جس چیز کو چند لمحوں میں بتا سکتا ہے اسی کو اگر الفاظ میں بیان کیا جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور پھر بھی شاگردوں کے لیے لفظی بیان کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کرنا مشکل ہو جائے۔ پھر کتاب کے حسن کلام اور اس کے کمال ایجاز کا غارت ہو جانا مزید براں۔ یہ حکیمانہ قاعدہ جس کو معمولی انسان تک اپنے علوم وفنون کی تعلیم میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ آپ کی خواہش ہے کہ وہ سب سے بڑا حکیم جس نے قرآن نازل کیا ہے اس کو نظر انداز کر دیتا۔ آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں نماز کے اوقات کا نقشہ بناتا، رکعتوں کی تفصیل دیتا، رکوع وسجود اور قیام وقعود کی صورتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرتا۔ بلکہ نماز کی رائج الوقت کتابوں کی طرح ہر صورت کی تصویر بھی مقابل کے صفحات پر بنا دیتا۔ پھر تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک جو کچھ نماز میں پڑھا جاتا ہے وہ بھی لکھتا اور اس کے بعد وہ مختلف جزئی مسائل تحریر کرتا جن کو معلوم کرنے کی ہر نمازی کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن کے کم از کم دو تین پارے صرف نماز کے لیے مخصوص ہو جاتے۔ پھر اسی طور پر دو دو تین تین پارے روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل پر بھی مشتمل ہوتے اس کے ساتھ شریعت کے دوسرے معاملات بھی جو قریب قریب زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں۔ جزئیات کی پوری تفصیل کے ساتھ درج کتاب کیے جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ آپ کی یہ خواہش تو پوری ہو جاتی کہ شریعت کا کوئی مسئلہ "غیر از قرآن" نہ ہو۔ لیکن اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

۴۔ یہ تو آپ کو بھی تسلیم ہے کہ قرآن حکیم میں نماز، روزہ اور دوسرے ارکان اسلام کی تفصیلات بیان نہیں کی گئی ہیں بلکہ صرف ان کی فرضیت پر زور دیا گیا ہے، ان کے قائم کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ اور کہیں کہیں ان کے ادا کرنے کے طریقوں کی طرف بھی اشارات کر دیئے گئے ہیں۔ جو عملی تفصیلات پر کسی طرح بھی مشتمل نہیں کیے جا سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کی تفصیلات مقرر کرنے والا کون ہو؟ کیا یہ کام ہر شخص کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دینا چاہیے تھا کہ جو جس طرح چاہے عمل کرے؟ اگر ایسا ہوتا تو دو مسلمانوں کی نمازیں بھی شاید ایک طریقے پر نہ ہوتیں اور نہ دوسرے ارکان اسلام کے عملی طریقوں میں مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی۔ آج آپ "جس شیرازۂ قومی" کے انتشار کا ماتم فرما رہے ہیں وہ صرف چند آرڈروں کے اختلاف کی وجہ سے ہے تاہم ہر آرڈر میں لاکھوں، کروڑوں مسلمان مجتمع ہیں۔ لیکن اگر ہر شخص قرآن کے احکام کی عملی تفصیلات مقرر کرنے میں خود مختار ہوتا تو اسلام کے پیرووں میں سرے سے کوئی آرڈر ہی نہ ہوتا۔ ان مختلف افراد کو جس چیز نے ایک قوم بنایا ہے وہ اعتقاد و عمل کی یک رنگی و یکسانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ نظام جماعت کو قائم کرنے میں اعتقاد کے اشتراک سے بڑھ کر عمل کا اشتراک کارگر ہوتا ہے کیوں کہ انسان حواس کا بندہ ہے اور اس کے حواس کو محسوس صورتیں ہی متاثر کر سکتی ہیں اور انہی صورتوں کی یکسانی و یک رنگی اس میں جمعیتہ کا احساس پیدا کرتی ہے۔ لہذا طریقہائے عمل کو افراد کے اختیار پر چھوڑ دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ محض اعتقاد کے اشتراک سے مسلمان کبھی ایک قوم نہ بن سکتے۔

پس جب یہ مسلّم ہے کہ وحدت قومی کے لیے اتحادِ عمل ناگزیر ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن میں وہ تفصیلات نہیں دی ہیں جن سے یہ اتحاد حاصل ہوسکتا تھا تو پھر آپ ہی بتایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کس کو یہ حق پہنچتا تھا کہ قرآن کے مطابق عمل کرنے کے طریقے اور ضابطے مقرر کرتا؟ اس کے سوا اور کس طریقے پر امّت جمع ہوسکتی تھی؟ ان کے سوا اور کون تھا جسے حاکم اعلیٰ تسلیم کرکے سب مسلمان اس کی تقلید پر متفق ہو جاتے؟ یہ آنحضرت ہی کا فیض تعلیم تو ہے جس کی بدولت آج ساڑھے تیرہ سو برس سے تمام مسلمان ایک ہی ہیئت سے نماز پڑھتے، ایک ہی طریقہ سے حج کرتے ہیں، ایک ہی زمانہ میں ایک ہی طرح روزے رکھتے ہیں فرق جو کچھ بھی ہے محض جزئیات کا ہے اور وہ بھی اس بنا پر نہیں ہے کہ کوئی مسلمان خود اپنے آپ کو ان جزئیات کے مقرر کرنے کا حقدار سمجھتا ہو بلکہ اس بنا پر ہے کہ ہر گروہ اپنے علم کے مطابق ہر جزئیہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسنون سمجھتا ہے جس پر وہ عامل ہے۔ باقی رہی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت اور آپ کی سنّت کا واجب التقلید ہونا، تو گنتی کے چند افراد کے سوا تمام امت اس پر متفق ہے اور اسی اتفاق پر مسلمانوں کی وحدت قومی کا انحصار ہے۔

۵۔ آپ قرآن مجید میں ایک مرتبہ پھر غور سے ملاحظہ فرمایئے کہ اس میں روزہ، حج اور زکوٰۃ کی تفصیلات کہاں ہیں؟ زکوٰۃ کے متعلق تو یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ کن چیزوں پر کتنی زکوٰۃ دی جائے اور زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے۔ حج اور روزہ کے جن احکام کو آپ تفصیل سے تعبیر کر رہے وہ نماز کے احکام سے بھی زیادہ مجمل ہیں آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن مجید میں اوّل سے آخر تک اس قاعدہ کو ملحوظ

رکھا گیا ہے کہ پورا زور بیان ایمانیات کی تعلیم ہی میں صرف کر دیا جائے کیوں کہ یہی دین کی بنیاد ہے۔ رہے عبادات اور معاملات کے احکام تو ان کے صرف اصول اور اتہات مسائل بیان کر دیئے جائیں اور تفصیلات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دیا جائے۔

۴۔ مسلمان کی تباہی کا اصل سبب روایات نہیں ہیں بلکہ نفسانیت اور عصبیت جاہلیہ اور فروع کو اصول سے بڑھ کر اہمیت دینے کی حماقت اور کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ کو چھوڑ کر اپنے مزعومات میں حد سے زیادہ غلو کرنے کی عادت اور نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کا شوق ہے اگر یہ نہ ہو تو روایات کے اختلاف سے کوئی فتنہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ روایات خواہ ضعیف ہوں یا قوی، اور ان کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف پایا جاتا ہو، بہر حال ان سب کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اور ان مختلف روایتوں کو ماننے والے اس امر میں بہر طور متفق ہیں کہ وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حاکم اور پیشوا مانتے ہیں۔ علاوہ ازیں روایات کے اختلاف سے صرف فروع میں اختلاف واقع ہوتا ہے۔ باقی رہے اصول دین تو وہ سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور تمام مسلمانوں میں مشترک ہیں پس اگر مسلمان خلوص نیت کے ساتھ اس حقیقت کا ادراک کر لیں کہ وہ سب کتاب اللہ کے ماننے والے اور رسول اللہ کا اتباع کرنے والے ہیں اور ان کے درمیان اصول دین مشترک ہیں تو جزئیات میں مختلف طریقوں پر قائم رہتے ہوئے بھی باہم متحد رہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس کا ادراک نہ ہو تو روایات کا سارا دفتر نذر آتش کر دینے سے بھی اختلاف دور نہیں ہو سکتا۔ انسان کے نفس

میں وہ شیطان موجود ہے جو قرآن کو بھی جنگ و جدل کا آلہ بنانے سے نہیں چوکتا۔

"ایک آرڈر" آپ کس معنیٰ میں چاہتے ہیں؟ اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ فروع میں کوئی اختلاف نہ ہو تو جب تک انسان کی فطرت نہ بدل جائے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا بشری فطرت کے ساتھ تو یہ بھی ممکن نہیں کہ صرف دو ہی آدمیوں کا نقطۂ نظر بالکلیہ ایک ہو جائے لہٰذا ایسا "ایک آرڈر" تو کبھی قائم نہیں ہو سکتا جس میں کسی نوع کا اختلافِ رائے اور اختلاف عمل سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ ہاں اگر آپ "ایک آرڈر" سے مراد ایسا آرڈر لیتے ہیں جو اصولوں کی وحدت پر مبنی ہو تو خدا کی کتاب اور اس کے رسول ؐ نے ایسا ہی آرڈر قائم کیا تھا اور وہ ہر وقت ہو سکتا ہے بشرطیکہ مسلمان اصول اور فروع کا فرق سمجھ لیں اور دونوں کے مراتب میں امتیاز کرنا سیکھ جائیں۔

(ترجمان القرآن، شعبان ۵۳ھ، نومبر ۳۴ء)